ماہنامہ
بیداری
حیدر آباد

مدیر
☆☆☆
حافظ محمد موسیٰ بھٹو

زیر اہتمام
☆☆☆
سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ
400-بی لطیف آباد4-حیدر آباد
E-MAIL
m.moosabhutto@gmail.com
www.bedarimillat.com

موبائل نمبر:
03463216078

جلد بائیسواں شمارہ۔جولائی 2026
قیمت: 25روپے، سالانہ: 300روپے

قرآن کا پیام (مستقل سلسلہ)	محمد موسیٰ بھٹو	۲
ہمارے نام		
نوجوان اور عصر حاضر کے فتنے	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	۶
دل	ڈاکٹر مفتی فہد انوار	۴۴
قرآن اور جدید طبّی تحقیقات کی روشنی میں		
اقتدار اور منصب کے فوائد و نقصانات	محمد موسیٰ بھٹو	۵۳
انسانی شخصیت کا اسفل حصہ اور اس کا کردار	محمد موسیٰ بھٹو	۵۵
انسانیت کا سب سے بڑا المیہ	محمد موسیٰ بھٹو	۵۷
نفسا نفسی کی بڑھتی ہوئی حالت		
تنقیدی نفسیات اور اس کی خرابیاں		۵۸
کچھ ہاتھ آتا نہیں بے آہ سحر گاہی		۶۰
بے لگام طرز زندگی اور اس کے اثرات	محمد موسیٰ بھٹو	۶۲
انانیت کا نظریہ	مدیر	۶۴
اور اس سے بچاؤ کی ضرورت و صورت		
دماغ سے کام لینے کے اثرات	مدیر	۶۶
اپنی اصلاح سے غافل فرد کا		۶۸
معاشرے کے لئے باعث خطرہ ہونا		
روح کی غذا		۶۹
ہمارے کچھ اہم معاملات		۷۱
احادیث نبوی کی روشنی میں		

پبلشرز محمد موسیٰ بھٹو نے یادگار پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ 400بی لطیف آباد-4-حیدر آباد سے شائع کیا

محمد موسیٰ بھٹو

مستقل سلسلہ

قرآن کا پیام

ہمارے نام

قرآن

کا خشیت والوں کے لئے نصیحت کا ہونا

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (سورۃ طٰہٰ آیت ۳) (بلکہ اس (قرآن میں) نصیحت ہے اس شخص کے لئے جو (اپنے رب سے) ڈرتا ہے)۔

اس آیت میں قرآن سے نصیحت حاصل کرنے کے لئے خشیت کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے، خشیت سے مراد ڈر، خوف اور دل کا اللہ کے خوف سے سرشار ہونا ہے، جس شخص میں خشیت کے معمولی اجزاء بھی موجود ہوں گے، قرآن سے تعلق سے اس کی خشیت میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا، اللہ کی خشیت ہی وہ بنیاد ہے، جس سے زندگی میں حقیقی تبدیلی پیدا ہوتی ہے، قرآن کو اگر خشیت پیدا کرنے اور خشیت کی حالت میں اضافہ پر اضافہ کرنے والی کتاب قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، اس لئے کہ اس میں ماضی کی سرکش قوموں کی تباہی اور آخرت کے عبرتناک مناظر کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ بندہ مومن کو تڑپا دیتا ہے اور اس کی خشیت کی حالت میں اضافہ ہی کرتا رہتا ہے، اور خشیت کی خاصیت ہے کہ اس سے اعمال صالحہ صادر ہوتے ہیں اور نیکی پر چلنے کی راہ میں حائل دشواریاں دور ہوتی چلی جاتی ہے۔

قرآن کو ایک تو اپنے علم میں اضافہ کی خاطر نہ پڑھا جائے، اس لئے کہ اس سے علمیت تو آتی جائے گی، لیکن خشیت پیدا نہ ہو سکے گی، اگر خشیت پیدا ہوگی تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرآن میں موجود علم کا نور بھی حاصل ہوتا جائے گا، دوسرے یہ کہ قرآن کو دوسروں کو

سناتے رہنے والے کام کو ہدف بنانے کی خاطر نہ پڑھا جائے، اس لئے کہ اس سے اپنی ذات میں خشیت پیدا کرنے والا ہدف متاثر ہوگا، جب خشیت قابل ذکر حد تک پیدا ہو جائے گی تو قرآن کے ذریعے تذکیر کا کام انشاء اللہ از خود ہوتا رہے گا۔

اللہ کو چاہنے والوں کو

اپنی صحبت سے متمتع کرنے کی تاکید

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (سورۃ الکہف آیت ۲۸) (اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا پابند بنایئے جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودگی کے طالب ہیں)۔

اس آیت میں مربی اور حقیقی داعی کو تاکید فرمائی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں کے لئے دل کو ہر وقت کشادہ رکھیں اور ان کو اپنی صحبت کے فیوض سے بہرہ ور کریں، جو اللہ کے ذکر اور اس سے مانگتے رہنے کا مزاج رکھتے ہیں، جو تزکیہ نفس کی راہ پر گامزن ہیں، ایسے لوگوں کے لئے سینے کو ہر وقت کشادہ رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ وہ ذکر و فکر کے ذریعہ نفس پرستی اور مادیت پرستی کی قوتوں سے سخت معرکہ آرائی کی حالت میں ہوتے ہیں، ان کو مربی کی طاقتور ایمانی حالت اور روحانی اجزاء کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، جو صحبت کے ذریعہ ہی ممکن ہے، ایسے افراد کو اپنی صحبت سے نوازنا اور صحبت میں رکھنا یہ مربی کا فریضہ ہوتا ہے۔

اللہ کو چاہنے والے طالبوں کی اللہ تک رسائی کے سفر میں مربی کی صحبت کو غیر معمولی دخل ہوتا ہے، ایسے طالبوں کے لئے ہر صورت میں وقت نکالنا ضروری ہے، جس کی قرآن کی اس آیت میں تاکید فرمائی گئی ہے۔

مال و متاع کے صاحبان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ (سورۃ طٰہٰ آیت ۱۳۱) (اور ان لوگوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا، جن میں سے کچھ

گروہوں کو ہم نے آزمائش کی خاطر دنیا کی زندگی میں آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے)۔

اس آیت میں مالداروں سے بے نیازی کی روش اختیار کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مال آزمائش کی خاطر دیا جاتا ہے، مال کی کثرت میں مختلف قسم کی آزمائش ہیں، ایک یہ کہ مال آنے کے بعد فرد کا متوجہ الی اللہ ہونے کا عمل متاثر ہوتا ہے، یعنی مال سے مزید مال بنانے کا میلان اور رجحان غالب ہونے لگتا ہے، جس سے متوجہ الی اللہ ہونے کے لئے وقت نہیں ملتا، دوسرے یہ کہ مال سے حرص وہوس کے جذبات میں اضافہ ہوتا ہے، دل، مال میں ہی اٹکتا رہتا ہے، تیسرے یہ کہ مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے دل آمادہ نہیں ہوتا۔

مال کی یہ خصوصیات بد ایسی ہیں، جو عام طور پر مالداروں کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہیں، اس لئے مالداروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، البتہ کچھ خوش قسمت افراد ایسے بھی ہوتے ہیں، جو مال کی ان خصوصیات بد سے محفوظ ہوتے ہیں، ایسے خوش نصیب افراد کم ہی ہوتے ہیں۔

دوسروں کی اصلاح کے لئے کوشاں ہونا

ان اریدُ الاّ الاصلاحَ ما استطعتُ وما توفیقی الاّ باللہِ (سورۃ ھود آیت ۸۸) (میں تو تمہاری اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک میرا بس چلے اور میرا راہ پانا اللہ کی توفیق سے ہی ہے)۔

بندہ مومن کے جو کام ہیں، ان میں اپنا ایمان بنانا، اعمال سرانجام دیتے رہنا اور اپنی بساط کے مطابق دوسروں تک بات پہنچاتے رہنا شامل ہے۔

اس آیت میں اس تیسری چیز کا ذکر آیا ہے، لیکن یہ دعوتی کام پہلے کے دو کاموں کے بغیر نہیں ہو سکتا، جب بندہ اپنے ایمان میں اضافہ کرتے رہے اور اعمال کو بجالانے میں مستعد ہوتا

ہے تو اس کے بعد دوسروں تک دعوت پہنچانے کا کام اس کے ذمہ عائد ہوتا ہے، اور یہ کام بھی اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے ہی ہوتا ہے۔

اپنے آپ اور اہل وعیال کو آگ سے بچانا

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (سورۃ التحریم آیت ۶) (اے ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو بچاؤ (اس آگ سے) جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے)۔

یہ آیت بندہ مومن کو اپنی اصلاح اور اپنے اہل وعیال کی اصلاح کے لئے فکر مند بھی کرتی ہے تو متحرک بھی۔

بندہ مومن کا پہلا ہدف اپنی اصلاح کے ساتھ گھر والوں کی اصلاح وتربیت ہوتا ہے، وہ گھر میں تربیت کا ایسا ماحول بنانے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، جس سے نماز اور ذکر کی عادت پیدا ہو، زیادہ بولنے اور دوسری بُرائیوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو، اللہ کی رضامندی والے اعمال سرانجام دینے کے لئے آمادگی پیدا ہو، اگرچہ موجودہ دور میں بُرائیوں کے ہمہ گیر طوفان کی وجہ سے اس طرح کا ماحول پیدا کرنا دشوار تر ہوتا ہے، لیکن بندہ مومن کی اپنی بہتر زندگی اور بچوں کی تربیت کے لئے اس کی ہونے والی کوششوں کے اثرات ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

جہنم کی آگ کا تصور کرنا ہی لرزا دینے والی بات ہے، اس لئے جہنم والے اعمال سے خود بھی بچنا اور اہل وعیال کو بھی بچانے کی کاوش کرنا یہ بندہ مومن کا ہدف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد رشید ارشد

نوجوان اور عصر حاضر کے فتنے

یہ دنیا دار الامتحان ہے اور یہاں طرح طرح کے فتنوں اور آزمائشوں سے انسانوں کو جانچا جاتا ہے۔ بالخصوص عہد حاضر میں یہ فتنے نت نئے روپ میں سامنے آرہے ہیں اور آتے رہیں گے۔ ہماری نوجوان نسل کو ان فتنوں کے مقابلے کے لیے گزشتہ زمانے کے لوگوں سے کہیں زیادہ باخبر اور چوکنا رہنا ہوگا۔ اسی مناسبت سے یہ عنوان ''نوجوان اور فتنہ ہائے عصر'' اختیار کیا گیا ہے۔ سورۃ الملک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ ملک آیت:۲)

''اللہ تعالیٰ نے موت وحیات کو خلق کیا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون ہے جو عمل کے اعتبار سے زیادہ اچھا ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض سے پوچھا گیا: احسن عمل سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے فرمایا: ''عمل بالکل خالص اور صواب (نہایت درست) ہو۔'' سائل نے مزید وضاحت کے لیے درخواست کی تو فرمایا: ''خالص کا مطلب یہ ہے کہ عمل اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے اور صواب کا مطلب یہ ہے کہ عمل رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہو۔''

ہم جس دور میں رہتے ہیں اس میں غالب تہذیب مغربی تہذیب ہے اور ہر چیز کا معیار وہیں سے متعین ہوتا ہے۔ خوب وزشت کا حسن وقبح کا خیر وشر کا صحیح وغلط کا معیار وہیں متعین ہوتا ہے۔ آیت مبارکہ کی اس تشریح سے ہمارے لیے بالکل واضح ہو گیا کہ جو بھی چمک دمک ہمیں مغرب میں نظر آتی ہے، نئے فیشنز ہیں trends ہیں، وہ ''احسن عمل'' نہیں ہیں۔ احسن عمل وہ ہے جو اللہ کے لیے کیا جائے یعنی اس کی نیت باطنی سطح پر یہ ہو کہ اللہ کو خوش کرنا ہے، جبکہ ظاہری صورت یہ ہو کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے اسوہ کے مطابق ہو۔

یہاں تو بات کی گئی ہے ''فتنہ'' کے حوالے سے۔ مذکورہ بالا عنوان میں دو لفظ زیادہ اہمیت کے حامل ہیں: ''عصر'' اور ''نوجوان''۔ عصر کا مطلب ہے زمانہ یا وقت۔ ہر زمانے

میں مشکلات اور آزمائشیں موجود رہی ہیں لیکن دور حاضر کچھ ایسے نئے مسائل اور چیلنجز لے کر آیا ہے جو پہلے زمانوں میں نہیں تھے۔ یوں کہیے کہ فتنے تو ہمیشہ سے تھے، اب ان کی شکل اور انداز بدل گئے ہیں۔

دوسرا اہم لفظ ہے ''نوجوان''۔ انسان کی زندگی کے سب سے اہم اور طاقت ور دور کو جوانی کہتے ہیں۔ یہ وہ عمر ہے جب انسان کے اندر جوش، ولولہ، توانائی اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت عروج پر ہوتی ہے۔ سورۃ الکہف میں ارشاد ہے:

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى

''یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے، تو ہم نے ان کو بڑھا دیا ان کی ہدایت میں۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں سورۃ الانبیاء میں ذکر آتا ہے کہ جب انہوں نے بتوں کو توڑ دیا اور یہ بات پھیلی کہ کسی نے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو لوگ کہنے لگے:

سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ (سورۃ الانبیاء آیت:۶۰)

ہم نے ایک نوجوان کو سنا جو ان بتوں کا ذکر کر رہا تھا۔''

پھر نوجوانی کا ایک نمونہ قرآن مجید میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس ابتلا میں وہ ڈالے گئے، وہ بہت بڑے آزمائش تھی۔ ترمذی شریف کی ایک حدیث سے اس آزمائش کی سنگینی اور اس میں ثبات کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(سبعة يظلهم الله تعالىٰ فى ظله يوم لا ظل الا ظله)** ''سات قسم کے افراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا، اس دن جب اللہ کے عرش کے سائے کے سوا کوئی اور سایہ نہیں ہوگا۔'' ان میں ایک قسم یہ ہے: **(رجل دعة امراة ذات منصب وجمال فقال: انى اخاف الله)** ''ایک ایسا شخص جس کو بہت باوقار اور منصب والی، کسی اونچے خاندان کی خوب صورت عورت دعوت گناہ دے، اور وہ یہ کہے: ''میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں''۔ گویا قرآن نے بھی نوجوانوں کی استقامت کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اسی حدیث میں ایک اور قسم بھی ہے جس کا تعلق ہمارے عنوان سے ہے: **(شاب نشا فى**

عبادۃ اللّٰہ) ''وہ نوجوان جو اللہ کی بندگی ہی میں پروان چڑھا، اس کی تربیت اور پرورش اسی میں ہوئی۔''

اسی طرح ترمذی شریف کی ایک حدیث ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: '' بنی آدم کے قدم اس وقت تک رب کے حضور سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ باتوں کا حساب نہ لے لیا جائے۔'' ان پانچ سوالات میں سے دو یہ ہیں: **(عن عمرہ فیم افناہ)** ''اس کی پوری زندگی کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ کہاں فنا کی!'' **(وعن شبابہ فیم ابلاہ)** ''اس کی پوری زندگی کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ کہاں فنا کی!'' **(وعن شبابہ فیم ابلاہ)** ''اور اس کی جوانی کے بارے میں کہ کہاں خرچ کی؟'' یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جب پہلے سوال میں عمر یعنی پوری زندگی کا ذکر ہو چکا، تو پھر جوانی کا الگ سے ذکر کیوں؟ یہ عطف الخاص علی العام کی ایک مثال ہے۔ یعنی پہلے عمومی بات کی گئی، پھر اسی کے ایک خاص حصے کو الگ سے بیان کر کے اس کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی زندگی کا سب سے قیمتی اور نازک مرحلہ ہے، جس کے بارے میں الگ سے باز پُرس ہو گی۔

غالب تہذیب کا نفسیاتی و فکری رعب

عصر حاضر کے فتنوں کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر مغربی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ ''مغربیت'' محض ایک جغرافیائی اصطلاح نہیں۔ اس سے مراد وہ غالب نظام فکر ہے جس نے دنیا پر نہ صرف سیاسی و معاشی تسلط حاصل کیا، بلکہ علمی و نظریاتی میدان میں بھی اپنی بالادستی قائم کر لی ہے۔ انسانی نفسیات کا یہ خاصہ ہے کہ وہ قوت سے مرعوب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب کا رعب صرف اس کی مادی طاقت کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کے سائنسی، تعلیمی اور فکری غلبے کے باعث نوجوان کے اعصاب پر سوار ہے۔

مشہور مورخ ابن خلدون نے اپنے شہرۂ آفاق '' مقدمہ'' میں اس عمرانی حقیقت کی تفصیل سے وضاحت کی ہے کہ: ''مفتوح قومیں شعوری یا لاشعوری طور پر فاتح اقوام کی نقالی

کرتی ہیں۔'' وہ ان کے لباس، طرز معاشرے زبان اور افکار کو اپنا کر ہی خود کو معتبر سمجھنے لگتی ہیں۔ عصر حاضر ہمارے نوجوانوں کا المیہ یہی ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے اسی سحر میں گرفتار ہو کر اپنی شناخت گم کر رہے ہیں۔

مغربی تہذیب کے ان گہرے اثرات کے نتیجے میں جن نمایاں فتنوں نے جنم لیا ہے، ان کی فہرست طویل ہے، البتہ درج ذیل سر فہرست ہیں:

☆ مسکرات و منشیات: نشہ و خمار کی مختلف صورتیں جو حواس کو معطل کر دیتی ہیں۔

☆ جنسی بے راہ روی: اخلاقی حدود کی پامالی اور صنفی انارکی

☆ فکری الحاد: دین سے بے زاری اور وجود باری تعالیٰ سے غفلت

☆ شعائر اسلام سے دوری: نماز اور دیگر فرائض و عبادات کی ادائیگی میں غفلت

☆ اباحیت پسندی: فحاشی، عریانی، موسیقی اور محض لذت پرستی کو زندگی کا مقصد بنا لینا (Hedonism)

یہ فتنے بلاشبہ آج کے نوجوانوں کے لیے سنگین ترین چیلنجز ہیں۔ الحمدللہ، عہد حاضر کے بہت سے مصلحین اور اہل علم ان موضوعات پر مؤثر انداز میں آواز اٹھا رہے ہیں اور اصلاح معاشرہ کے لیے کوشاں ہیں۔ تاہم، اس تحریر میں ہماری توجہ کا مرکز ان روایتی فتنوں سے ہٹ کر وہ پوشیدہ ذہنی، فکری اور معاشرتی الجھنیں ہیں جو بظاہر کھلم کھلا دینی یا اخلاقی فساد کی صورت میں تو نظر نہیں آتیں، مگر خاموشی سے انسان کے ایمان، اس کی خودی اور شخصیت کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔

جدید ''ازمز'' (Isms) اور فکری یلغار

عصر حاضر کے نوجوانوں کے درپیش فکری و تہذیبی چیلنجز کے تناظر میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ جدید ازمز (Isms) مثلاً لبرل ازم، مارکس ازم، ایگناسٹک ازم، ہیومن ازم اور کیپٹل ازم پر مدلل گفتگو کی جائے۔ ان نظریات کی تفہیم اور تنقیدی جائزہ اس لیے ناگزیر ہے تاکہ ہماری نوجوان نسل ان کی ظاہری چمک دمک کے سحر میں مبتلا ہونے کے بجائے ان کی فکری جڑوں اور زہریلے اثرات سے شعوری طور پر باخبر ہو سکے۔ یہ تمام نظریات دراصل

جدیدیت (Modernity) ہی کے مختلف روپ ہیں، جن کا بنیادی ہدف انسان کو تصور خدا، الہامی وحی اور آخرت کی جواب دہی کے احساس سے کاٹ کر محض مادی وجود تک محدود کر دینا ہے۔

آج کل ایک اصطلاح ''فکری فیشن'' کی طور پر بہت مقبول ہو رہی ہے، اور وہ ہے مسلم شناخت (Muslim Identity) کا تحفظ۔ یہ نعرہ ہر طرف گونج رہا ہے کہ مسلم نوجوان اپنی شناخت کھو رہے ہیں اور ہمیں اس کی بقا کی جنگ لڑنی ہے۔ بلاشبہ یہ تشویش درست اور حالات کا اہم تقاضا ہے، لیکن اس بحث کا ایک نہایت نازک پہلو وہ ہے جسے عموماً نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

نوجوانوں کے فکری فتنے

زیر نظر تحریر میں جس مسئلے کی نشان دہی کرنا مقصود ہے وہ ان نوجوانوں سے متعلق ہے جو بظاہر دینی رجحان رکھتے ہیں، جن کے چہرے پر داڑھی ہے، جو دینی مجالس میں شریک ہوتے ہیں، یا جو دینی اداروں سے وابستہ ہیں۔ جب ہم کسی فتنہ زدہ نوجوان کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں تو عام طور پر یہ تصور ہی ذہن میں اُبھر آتا ہے کہ کوئی ایسا نوجوان ہے جو پھٹی ہوئی جینز پہنے ہوئے ہے، بالوں میں اسپائکس ہیں، کانوں میں بندے ہیں، اور ہاتھوں میں کڑے۔ بس یہی نوجوان فتنہ بن گیا ہے۔ درحقیقت خطرہ صرف یہی نہیں ہے۔ ایک نہایت نازک اور کم زیر بحث آنے والا فتنہ وہ ہے جو مذہبی ماحول کے اندر موجود ہے، اور وہ ہے ہمارے مذہبی نوجوانوں پر جدیدیت کا اثر۔ جدیدیت نے صرف یونیورسٹی، اسکول، کالج، یا میڈیا ہی کو متاثر نہیں کیا، بلکہ مذہبی طبقے، مذہبی فکر اور مذہبی حساسیت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہ بات شاید کچھ لوگوں کو ناگوار گزرے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ جدیدیت نے ہمارے دین کو سمجھنے کے انداز، اس کے بیان کے اسلوب، اور اس پر عمل کے اطوار کو بھی متاثر کیا ہے۔ مذہب ہمارے ذہن میں فرد کا ایک ذاتی مسئلہ بن کر رہ گیا ہے۔ دین کا اجتماعی، تمدنی، سیاسی اور تہذیبی پہلو رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ جدید فکر کے زیر اثر ہو رہا ہے، چاہے ہم اسے مانیں یا نہ

مانیں۔ علامہ اقبال نے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے بارے میں جو سخت اور کڑوی مگر حقیقت پر مبنی باتیں کہیں، وہ آج بھی حیرت انگیز حد تک موزوں معلوم ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مردہ ہے، مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

اس کا تو سانس بھی اپنا نہیں ہے، یعنی بظاہر وہ زندہ ہے مگر فکری و روحانی طور پر مردہ ہے۔ اس کی سانسیں بھی مستعار ہیں۔ ایک اور مقام پر علامہ اقبال نے کہا:

تیرا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

آج ہمارے ہاں جو طبقہ BNU, NCA,IBA,LUMS جیسے اداروں سے نکل کر معاشرے میں کردار ادا کر رہا ہے، وہ بڑی حد تک اسی مستعار شناخت (borrowed identity) کا حامل ہے، جو اقبال کے ان اشعار کا عملی نمونہ بن چکا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر C.S.Lewis نے بھی ۱۹۳۰ء کی دہائی میں انگلی رکھی تھی۔ وہ اس نظام تعلیم سے پیدا ہونے والی نسل کو trousered apes کہتا ہے، یعنی پتلون پہنے ہوئے بندر۔ بظاہر مہذب، مگر حقیقت میں فکری حیوانیت کا شکار۔ اس نسل کی ایک اور جھلک علامہ اقبال کے اس شعر میں دیکھی جا سکتی ہے:

نوجوانان تشنہ لب، خالی ایاغ
شستہ رو، تاریک جان، روشن دماغ

ایک ایسا نوجوان جو چہرے سے صاف ستھرا، دماغ سے روشن، مگر دل سے تاریک اور روح سے پیاسا ہے۔ یہ وہی طبقہ ہے جس پر اکبر الٰہ آبادی نے طنز کا نشتر چلایا تھا:

مشرق میں ولادت پر راضی نہ تھے یہ بندے
چارہ ہی مگر کیا تھا، فطرت جو یہاں جن دے

یعنی یہ لوگ اپنی مشرقی شناخت پر شرمندہ ہیں، ان کی خواہش ہے کہ کاش وہ مغرب میں پیدا ہوتے۔ ایک اور موقع پر انہوں نے تہذیبی مرعوبیت اور خود فراموشی پر نہایت پُر اثر طنز کرتے ہوئے کہا:

اے خدا! مجھ کو کر دے صاحب لوگ دور ہو مجھ سے اس جنم کا روگ
میرا قالب ہو قالب غربی بھول جاؤں زبان بھی اپنی
رنگ چہرے کا میرے جائے بدل کروں ایجاد میں بھی توپ و رفل
سو کے اٹھوں جو آج صبح کو میں لوگ سمجھیں کہ لاٹ صاحب ہیں

بحرانِ شخصیت: محض فیشن نہیں، فکری انخلا

اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ نسل نو کا اصل مسئلہ محض مغربی لباس پہننا یا ان کی موسیقی سے لطف اندوز ہونا نہیں ہے، بلکہ اس کا اصل بحران ''تہذیبی بے چارگی'' ہے۔ یہ نسل خود کو مغربی معیار تہذیب کی ترازو میں تولتی ہے اور ہر اس قدر کو حقیر سمجھتی ہے جس کا تعلق اس کی اپنی فکری، مذہبی اور روحانی جڑوں سے ہے۔ یہ فکری غلامی اسے ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں وہ جسمانی طور پر تو موجود ہے، مگر اس کا دل اور دماغ مغرب کے ''عمارت گروں'' کی تعمیر کردہ عمارت کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ یہ نوجوان جن کے طرز فکر پر ہم تنقید کر رہے ہیں، ہمارے اپنی ہی بچے اللہ کے بندے اور رسول اللہ ﷺ کے امتی ہیں۔ ان کے افکار سے اختلاف اپنی جگہ، مگر ہمارا رویہ نفرت کے بجائے سراسر خیر خواہی اور اصلاح احوال کے جذبے پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں سیدنا مسیح علیہ السلام کا وہ قول نہایت بصیرت افروز ہے جسے امام مالک نے ''موطا'' میں روایت کیا ہے:

ولا تنظروا فی ذنوب الناس کانکم ارباب وانظروا فی ذنوبکم کانکم عبید فانما الناس مبتلی ومعافی فارحموا اهل البلاء واحمدوا الله علی العافیة۔ (موطا مالک ۱/ ۷۵۱)

''تم لوگوں کے گناہوں کو اس طرح نہ دیکھو گویا تم ان کے خدا (مالک) ہو، بلکہ اپنے گناہوں کو اس طرح دیکھو جیسے تم بندے ہو۔ لوگ صرف دو ہی طرح کے ہیں: یا عافیت میں

ہیں یا آزمائش (ابتلا) میں۔ پس آزمائش میں مبتلا لوگوں پر رحم کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں عافیت عطا فرمائی۔''

یہی وہ زاویۂ نگاہ ہے جو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔ ہماری تنقید میں دل کا درد اور زبان کی خیر خواہی شامل ہونی چاہیے، تاکہ یہ نسل مغربی سانچوں میں ڈھلنے کی آرزو ترک کر کے اپنی اصل شناخت کو پہچانے اور اس پر فخر کرنا سیکھے۔

وہ نوجوان جو دینی حلقوں کو فکری مغالطے (false consciousness) کا شکار سمجھ کر حقارت سے دیکھتے ہیں، ان کے جواب میں ہمیں خود کو خدائی منصب پر فائز نہیں کر لینا چاہیے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی نصیحت ہمارے زعم تقویٰ پر ایک کاری ضرب ہے: ''خدا کی طرح نہ دیکھو، بندوں کی طرح دیکھو!''

کائنات میں انسانی تقسیم کا اصل معیار مادی ترقی نہیں بلکہ ہدایت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی بندگی اور دین کی تھوڑی بہت توفیق عطا کی ہے، تو آپ ''صاحب عافیت'' ہیں، چاہے زندگی کتنی ہی پر مشقت کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ سے دور ہیں، وہ درحقیقت ''اہل بلا'' (آزمائش زدہ) ہیں، چاہے بظاہر ان کے حالات کتنے ہی روشن خیال اور ترقی یافتہ کیوں نہ لگیں۔ ہمارا فریضہ صرف یہ ہے:

(فارحموا اهل البلاء واحمدوا الله علی العافیة)

''اہل بلا پر رحم کرو اور اللہ کا شکر بجالاؤ کہ اس نے تمہیں عافیت دی۔''

بندگی کی یہ توفیق اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، نہ کہ ہماری اپنی کسی فضیلت کا نتیجہ۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، یہ گفتگو ان فتنوں کے بارے میں ہے جو بظاہر نظر آتے ہیں۔ اس تناظر میں حکیم الامت علامہ اقبال کے یہ اشعار اس پوری صورت حال کو ایک نیا اور فکر انگیز زاویہ عطا کرتے ہیں:

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

ہم یہ گمان رکھتے تھے کہ مذہبیت کی جو ایک نئی رو چل پڑی ہے، ایک دینی بیداری، رجوع الی اللہ، اس کے نتیجے میں بندگی میں اضافہ ہوگا، خیر عام ہوگا، اور معاشرہ اخلاقی طور پر سنورے گا۔ البتہ اب ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے ساتھ کچھ ناپسندیدہ پہلو بھی سامنے آرہے ہیں، اور آج ہمیں انہی پر کچھ غور و فکر کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے زندگی گزارنے کے دو منہج بیان کیے ہیں، جو ہمارے حالیہ منظر نامے کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ ایک منہج تو یہ ہے: ''زمانہ باتو نہ سازد، تو بازمانہ ساز!''

علامہ اقبال اس منہج کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز!

یعنی جو لوگ زندگی کے حقائق سے بے خبر ہیں یہ ان کا نظریہ ہے کہ اگر زمانہ تم سے سازگار نہیں، تو تم زمانے سے سمجھوتا کر لو۔ یہ پہلا رویہ ہے مطابقت، مفاہمت، اور بالآخر زمانے کے دھارے میں بہ جانے کا۔ دوسرا رویہ ہے:

زمانہ باتو نہ سازد، تو بازمانہ ستیز!

یعنی زمانہ تم سے موافقت نہ کرے تو اس سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ! الحمدللہ، آج لاکھوں ایسے نوجوان موجود ہیں جن کے دل میں مختلف شخصیات اور تحریکی افکار نے ''بازمانہ ستیز'' کی تڑپ اور دینی غیرت پیدا کر دی ہے۔ وہ مصلحت پسندی کے بجائے نظام باطل سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

مذہبی نوجوان اور اہل علم سے دوری: ایک نیا فتنہ

اسی بیداری کے بطن سے ایک تشویش ناک رجحان نے جنم لیا ہے، اور وہ ہے: ''علمائے کرام اور اہل مدارس سے بے زاری۔'' اس بے زاری کی کیفیت مختلف سطحوں پر موجود ہے،

کہیں یہ محض لاتعلقی ہے، کہیں بدگمانی اور کہیں تحقیر و نفرت کا روپ دھار چکی ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ وہ نوجوان جو بظاہر دین کے لیے جاگا ہے، وہ اہل دین ہی سے نالاں ہے۔

بلاشبہ، علماء معصوم نہیں ہیں۔ زوال کے اس دور میں کوئی بھی طبقہ کمزوریوں سے مبرا نہیں رہا۔ علماء کے گروہ میں علمائے سوء کا وجود ایک ایسی حقیقت ہے جس سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو نصوص شرعیہ اور تاریخ سے ناواقف ہو۔ ہمیں خود بھی بحیثیت طالب علم علماء سے کئی علمی شکایات رہی ہیں، جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) فرقہ واریت اور تکفیری مزاج: علماء کا ایک بڑا حلقہ فقہی تعصبات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ معمولی علمی و فقہی اختلافات کو بنیاد بنا کر تکفیر کے فتوے جاری کرنا اور اسے ایمان و کفر کا مسئلہ بنا دینا، نوجوانوں کو دین سے نہیں تو دین داروں سے ضرور بدظن کر دیتا ہے۔

(۲) عصر حاضر سے فکری دوری: یہ ایک جان دار اعتراض ہے کہ علماء کی اکثریت جدید دنیا کی حرکیات (dynamics) سے واقف نہیں۔ وہ سماجی، سیاسی اور عالمی منظر نامے کے فہم سے عاری ہو کر محض مساجد و مدارس تک محدود ہو گئے ہیں، جس کی وجہ سے نئی نسل کے پیچیدہ سوالات اور ان کی زبان سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(۳) اسلوب بیاں کی خشکی: علماء کے خطاب میں اکثر وہ فکری گہرائی، ادبی حسن اور قلبی کشش مفقود ہوتی ہے جو جدید ذہن کو متاثر کر سکے۔ ان کا اسلوب روایتی اور خشک ہے، جو ترغیب کے بجائے بے زاری کا سبب بنتا ہے۔

(۴) تصور دین کی محدودیت: یہ تاثر عام ہے کہ علماء نے دین کو محض انفرادی عبادات اور خانقاہی مشقوں تک محدود کر دیا ہے۔ دین کا اجتماعی و سیاسی پہلو، اقامت دین، عدل اجتماعی اور معاشی اصلاح جیسے اہم موضوعات ان کے دائرۂ فکر سے خارج نظر آتے ہیں۔

تنقید اور تخریب کے درمیان حد فاصل

مذکورہ بالا چاروں نکات اپنی جگہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، اور ان میں موجود صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ تاہم، اصل المیہ صرف ان خامیوں کا وجود نہیں ہے، بلکہ ان

کی آڑ میں پورے طبقۂ علماء کی مسلسل تشہیری تذلیل (scandalization) ہے۔ یہ طرز فکر نوجوانوں کے اذہان میں دین کے خادموں کے خلاف ایسی نفرت اور بے زاری پیدا کر رہا ہے جو دینی بیداری (Islamic Revival) کے ثمرات کو ضائع کر سکتی ہے۔

ہمیں اب جذباتیت کے بجائے توازن اور عدل کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ علماء کی علمی یا عملی لغزشوں پر تنقید کرنا بلاشبہ ایک تعلیمی حق ہے، مگر اس تنقید کا ادب اور انصاف کے دائرے سے باہر نکل جانا فکری خودکشی کے مترادف ہے۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ نقاد بننا نہایت سہل ہے، جبکہ مصلح اور خادم بننا کٹھن ترین عمل ہے۔ اصلاح کا راستہ نفرت اور تحقیر سے نہیں، بلکہ محبت، حکمت اور خالص خیر خواہی کے جذبے سے پھوٹتا ہے۔

اگر ہم نے علماء اور مدارس کے ادارے کو کلی طور پر منہدم کر دیا، تو ہمارے پاس دین کی حفاظت اور اس کی منتقلی کا کوئی دوسرا مستند متبادل موجود نہیں ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خامیوں کی نشان دہی اس نیت سے کریں کہ اصلاح ہو، نہ کہ اس جذبے سے کہ انتشار پھیلے۔

نوجوانی کی سحر انگیزی: ایک نیا فکری فتنہ

عصر حاضر میں نوجوانوں کی فکری و عملی متحرک سازی (mobilization) کے دوران چند ایسے رجحانات ابھرے ہیں جنہیں ایک سنجیدہ مسئلے کے طور پر دیکھنا ناگزیر ہے۔ ان میں سب سے نمایاں رجحان وہ ہے جسے ہم ''نوجوانی کی پوجا'' (Worship of Youth) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آج کل یہ نعرہ بہت عام ہے کہ: ''اب صرف نوجوان قیادت آنی چاہیے،'' ''بزرگوں کا عہد تمام ہوا'' یا ''پرانی نسل کی باتیں فرسودہ ہو چکی ہیں۔''

بظاہر پرکشش نظر آنے والے یہ نعرے دراصل اس مغربی فکر کی پیداوار ہیں جہاں فرد پرستی، بے لگام آزادی اور ہر قسم کی روایتی قدغن سے بغاوت کو ایک ''نظریہ'' بنا دیا گیا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ یہ جذباتیت اب ہماری دینی و فکری تحریکوں میں بھی سرایت کر رہی ہے۔

اقبال کے کلام کی تعبیر اور فکری مغالطے

اس رجحان کو تقویت دینے کے لیے اکثر علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے:

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

ادبی لحاظ سے یہ شعر بلاشبہ بے پناہ تحریک آمیز ہے، مگر فکری اور عملی سطح پر اس کی درست تفہیم و تاویل نہایت ضروری ہے۔ اگر اس شعر کے ظاہری مفہوم کو بنیاد بنا کر تجربے کو جذبات کے تابع اور حکمت کو جوش کے نیچے دفن کر دیا جائے، تو یہ ایک غیر فطری اور خطرناک فکری الٹ پھیر ہوگا۔

قیادت: جوش اور ہوش کا توازن

حقیقت حال یہ ہے کہ نظام فطرت کے تحت پیروں (بزرگوں) کو ہی جوانوں کا استاد ہونا چاہیے۔ بزرگوں کا نچوڑا ہوا تجربہ، اب کی سرد و گرم چشیدہ دوراندیشی اور فکری پختگی ہی وہ مینارۂ نور ہے جو نوجوانوں کے جوش و ولولے کو صحیح سمت عطا کرتا ہے۔ قیادت محض کسی خاص عمر کا نام نہیں، بلکہ یہ علم، تقویٰ، فہم اور بصیرت کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ صفات عموماً وقت کی بھٹی میں تپ کر ہی پختہ ہوتی ہیں۔ جوانوں کا جوش اگر بزرگوں کے ہوش کے ساتھ شامل نہ ہو، تو تحریکیں تعمیر کے بجائے تخریب کی راہ پر چل پڑتی ہیں۔

قرآن مجید نے عمر کے ساتھ حاصل ہونے والی نفسیاتی و عقلی بلوغت کو ایک آفاقی حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً (سورۃ الاحقاف: آیت: ۱۵)

''یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا، اور چالیس سال کی عمر کو پہنچ گیا۔''

یہ آیت محض جسمانی نمو کی بات نہیں کرتی، بلکہ ایک مخصوص عقلی اور شعوری پختگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی سب سے بڑی ذمہ داری یعنی ''نبوت''

کے لیے، سوائے چند مستثنیات کے، چالیس سال کی عمر ہی کو معیار بنایا گیا۔ گویا وحیٔ الٰہی نے انسانی شخصیت کی تعمیر میں عمر اور تجربے کی اہمیت کو خود تسلیم کیا ہے۔

برکت اکابر اور نبوی اصول ادب

سماجی ترتیب اور باہمی احترام کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ایک بنیادی ضابطہ فراہم کرتا ہے:

(البرکۃ مع اکابرکم) (شعب الایمان)

''برکت تمہارے بڑوں کے ساتھ ہے۔''

یہاں اکابر سے مراد وہ شخصیات ہیں جو عمر، علم، فہم یا تقویٰ و عبادت میں فوقیت رکھتی ہوں۔ اسلام میں عمر کا تقدم بذات خود ایک ایسی فضیلت ہے جو توقیر کی مستحق ہے۔ اس باب میں نبی کریم ﷺ کا فیصلہ کن ارشاد ملاحظہ ہو:

(لیس منا من لم یرحم صغیرنا ویعرف شرف کبیرنا) (سنن الترمذی)

''وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت (اور ان کے حق کو) نہ پہچانے۔''

دوسری روایت میں ہے:

(لیس منا من لم یرحم صغیرنا ویوقر کبیرنا) (صحیح الجامع: ۵۴۴۵)

''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا احترام نہ کرے۔''

ایک اور روایت میں ہے:

(لیس منا من لم یرحم صغیرنا ویعرف حق کبیرنا) (مسند احمد)

''وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور جو ہمارے بڑوں کے حق کو نہ پہچانے۔''

علمی تسلسل اور اصاغر کا فتنہ

ادب کا یہ تقاضا صرف عمر تک محدود نہیں بلکہ علم کے میدان میں اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں:

(لا یزال الناس بخیر ما اخذوا العلم عن اکابرھم ون امنائھم وعلمائھم فاذا اخذوہ من اصاغرھم وشرارھم ھلکوا) (المدخل الی السنن الکبریٰ)

''لوگ اس وقت تک خیر پر رہیں گے جب تک وہ اپنا علم اکابر اور معتبر علما سے حاصل کرتے رہیں گے، لیکن جب وہ اصاغر (کم علم اور ناتجربہ کار) اور فتنہ انگیزوں کی طرف رجوع کریں گے تو ہلاکت ان کا مقدر بن جائے گی۔''

آج ہم معلومات کے ایک ایسے سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں جہاں علم کا اعتماد اور نسبت مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ یوٹیوب اور سوشل میڈیا پر ایسے افراد نمودار ہو چکے ہیں جن کا نہ کوئی علمی پس منظر ہے اور نہ ہی کوئی معتبر شجرۂ علم۔ وہ محض اپنی چرب زبانی، دیدہ زیب ویڈیوز اور انگریزی اصطلاحات کے سہارے ایک فکری برانڈ قائم کر لیتے ہیں۔ نوجوان نسل ان کی ظاہری کشش سے مرعوب ہو کر ان کی شخصیت کی اسیر ہو جاتی ہے، حالانکہ وہ علم نہیں بلکہ محض ایک تاثر (impression) بیچ رہے ہوتے ہیں۔

علم کی نسبت: کیا کہا اور کس نے کہا؟

دین اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ علم کے حصول میں صرف بات اہم نہیں ہوتی بلکہ بات کہنے والے کی ثقاہت بھی ناگزیر ہے۔ امام عبداللہ بن مبارک کا قول اسے سلسلے میں مشعل راہ ہے:

فاما صغیر یروی عن کبیر فلیس بصغیر۔

''جو چھوٹا اپنے بڑوں سے جوڑتا ہے، وہ چھوٹا نہیں (وہ بڑا ہے)۔''

اس سے یہ سنہری اصول وضع ہوتا ہے کہ اگر کوئی نوجوان علم کے تسلسل سے جڑا ہے، اپنے اسلاف اور اکابر کا احترام کرتا ہے اور ان کے منہج علم پر گامزن ہے، تو وہ علمی وزن کے اعتبار سے بڑا ہی تسلیم کیا جائے گا، چاہے وہ عمر کے لحاظ سے نوجوان ہی کیوں نہ ہو۔

نفس علم اور مرکزیت ذات کا دھوکا

اگر کوئی نوجوان محض اپنے مطالعہ کی وسعت یا معلومات کی بہتات کی بنا پر خود کو ''مرکز علم'' گمان کرنے لگے اور اپنے سے بڑوں، مشائخ اور مصلحین کی ناقدری (discredit)

شروع کر دے، تو وہ در حقیقت خود کو بھی فکری ہلاکت میں ڈال رہا ہے اور دوسروں کی گمراہی کا سامان بھی کر رہا ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب کا قول اس ضمن میں نہایت بصیرت افروز ہے:

''الا وان الناس بخیر ما اخذوا العلم عن اکابرھم ولم یقم الصغیر علی الکبیر فاذا قام الصغیر علی الکبیر فقد ھلکو'' (شرح اصول اعتقاد اھل السنۃ للالکائی)

''خبردار! لوگ بھلائی پر رہیں گے جب تک علم کو اپنے بڑوں سے لیتے رہیں۔ اور جب چھوٹے، ناتجربہ کار یا کم علم، بڑے اہل علم پر غالب آجائیں، تو وہ ہلاک ہو جائیں گے۔''

یہ ایک سنہری اصول ہے کہ نظام حیات تبھی متوازن رہتا ہے جب بڑے چھوٹوں کی تربیت و نگرانی کریں، نہ کہ چھوٹے اپنے تئیں بڑوں کے نگران اور مصنف بن بیٹھیں۔

جوانی کی پوجا: ایک درآمد شدہ فکری بیماری

آج کل نوجوانی کا حد سے زیادہ ڈھول پیٹنا اور عمر رسیدہ یا تجربہ کار طبقے کو بوجھ یا فرسودہ سمجھنا ایک فکری مرض کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہ اسلامی فکر کا حصہ نہیں، بلکہ مغربی معاشروں کی پیدا کردہ وہ عمر پرستی (Ageism) ہے جہاں مادی افادیت ہی سب کچھ ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی فکری بگاڑ کی نشان دہی اُس وقت کی تھی جب انگریزی تہذیب کا غلبہ اپنی جڑیں جما رہا تھا:

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر کا یہ طنز دراصل اس نظام تعلیم پر تھا جس نے نئی نسل کو اپنے ماضی اور اپنے بزرگوں سے بیگانہ کر کے انہیں ایک مصنوعی '' روشن خیالی'' کے سراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک مغرب زدہ تعلیم یافتہ نوجوان اپنے بڑوں کو صرف اس لیے حقیر جانتا ہے کہ وہ جدید اصطلاحات سے ناواقف ہیں۔ اکبر ہی کا ایک شعر ہے:

بوڑھوں نے پہلے لڑکوں کو خود ہی بنایا کھیل
ان کی نظر میں آپ ہی اب کھیل ہو گئے

اکبر نے علی گڑھ تحریک کے دور میں جب یہ دیکھا کہ تعلیم کا مقصد صرف نوکری اور مادی ترقی رہ گیا ہے، تو انہوں نے اسے ''معزز پیٹ'' کا نام دیا۔ جب کسی قوم کی تعلیم کا قبلہ روٹی بن جائے، تو وہی اخلاقی انحطاط جنم لیتا ہے جو آج ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ جدیدیت کی اس لہر نے نسلوں کے درمیان ادب اور احترام کے رشتوں کو جس طرح پامال کیا، اکبر نے اس پر نہایت کرب کے ساتھ کہا:

تعلیم ہے لڑکوں کی کہ اک دام بلا ہے
اے کاش کہ اس عہد میں ہم باپ نہ ہوتے!

یہ شعر اس تہذیبی بے چارگی کی انتہا ہے جہاں باپ اپنی ہی اولاد کے ہاتھوں فکری طور پر ذلیل و خوار ہوتا نظر آتا ہے۔

جدید تعلیمی نظام: تربیت گاہ یا قتل گاہ؟

موجودہ تعلیمی ڈھانچا ایک ایسی آفت بن چکا ہے جس کی آغوش سے فتنہ اور فکری بے راہ روی جنم لے رہی ہے۔ آج ایک باشعور والد کے لیے سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ اسے اپنی اولاد کو ایک ایسے نظام کے سپرد کرنا پڑتا ہے جس پر اسے خود بھی اعتماد نہیں۔ یہ محض ایک تعلیمی انتخاب نہیں، بلکہ ایک وجودی مسئلہ ہے کہ ان معصوم ذہنوں کو کن کے حوالے کیا جائے! اکبر الٰہ آبادی نے اسی تلخ حقیقت کو نہایت سفاکی سے بیان کیا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

گلی محلوں میں غیر ملکی زبان اور انگریزی ناموں کے ساتھ کھلے یہ تعلیمی ادارے در حقیقت وہ مقتل ہیں جہاں نئی نسل کے ایمان اور تہذیبی تشخص کو بڑی بے دردی سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ لوگ پریشان ہیں کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل اور ایمان کے درمیاں توازن کیسے قائم کریں۔

ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جوانی کی بے لگام پرستش اور بزرگوں کی تحقیر کا رویہ سراسر غیر دینی ہے۔ یہ فکری بیماری اب صرف سیکولر طبقے تک محدود نہیں رہی،

بلکہ ان نوجوانوں میں بھی سرایت کر رہی ہے جو بظاہر مذہبی رجحان رکھتے ہیں۔ خاص طور پر تکنیکی ماہرین (technocrats) کا وہ طبقہ جو مختلف پیشہ ورانہ شعبوں جیسے MBA انجینئرنگ اور میڈیکل سائنسز، یا اکاؤنٹنگ وغیرہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہے، اس مرض کا زیادہ شکار نظر آتا ہے۔ یہ نوجوان بظاہر بہت سمجھ دار، سلجھے ہوئے اور جدید دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں، لیکن ان کی مذہبیت اکثر و بیشتر ان کے پیشہ ورانہ تکبر اور جدید فکری برتری کے نیچے دبی ہوتی ہے۔ وہ جدید علوم کی مہارت کو معیار بنا کر دینی اکابر کے تجربے اور روایت کو کم تر سمجھنے کی فکری غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

تخلیق نو بمقابلہ استناد: ڈیجیٹل دور کا فکری بحران

عصر حاضر کا ایک نمایاں فکری تضاد انفراد بمقابلہ استناد (Authenticity vs. Novelty) کی کشمکش ہے۔ آج کا دور جدت پسندی کا دور ہے، جہاں ہر شخص کچھ نیا کہنے، کچھ اچھوتا دکھانے اور ایک منفرد نقطۂ نظر پیش کرنے کی دوڑ میں مگن ہے۔ خاص طور پر اگر آپ کا تعلق مذہبی شوبز (religious showbiz) سے ہے اور آپ اس میں اپنا مقام بنانا چاہتے ہیں، تو سادہ اور روایتی اسلوب بیاں اب قاری یا سامع کو متاثر کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس بازار سیاست و ہوس میں کامیابی کے لیے چونکا دینے والے زاویے اور غیر معمولی اختراعات ناگزیر ہو چکی ہیں تاکہ عوام کی توجہ حاصل کی جا سکے اور ویوز (views) کی تعداد میں اضافہ ہو۔ برسوں پہلے ایک مشہور کتاب آئی تھی: Metaphors We Live By جس کا لب لباب یہ تھا کہ انسانی زندگی کچھ مخصوص استعاروں کے گرد گھومتی ہے۔ آج کی صورت حال اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہو چکی ہے۔ آج یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم Algorithms We Live By کے عہد میں جی رہے ہیں۔ ہماری ترجیحات، مشاہدات، یہاں تک کہ ذوق انتخاب بھی اعداد و شمار کے تابع ہو چکا ہے۔

آج کسی مذہبی اسکالر کی علمی ثقاہت کا فیصلہ اس کے ڈیجیٹل فٹ پرنٹ سے ہوتا ہے۔ اگر کسی ویڈیو کے ویوز کم ہوں، تو جدید ذہن فوراً اسے غیر اہم یا بوریت کا درجہ دے کر مسترد کر دیتا ہے۔ اب معیار علم یا روحانیت نہیں رہا، بلکہ یہ طے پایا ہے کہ مواد (content)

جاذب نظر اور تفرجی (entertaining) ہونا چاہیے۔ گانا ہو یا مذہبی بیان، اس کی قدر و قیمت کا تعین علم کے بجائے اس کے نیچے درج اعداد و شمار (numbers) کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، دین ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ علم حاصل کرنے سے پہلے ماخذ علم (source) پر نظر رکھی جائے۔ کلام کی حقیقی معنویت اس کے قائل (کہنے والے) سے کشید کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے کہ یہ ''اللہ کا کلام'' ہے۔

اگر کوئی جملہ بظاہر سادہ یا فہم سے بالاتر محسوس ہو، تو عام حالات میں انسان اسے نظر انداز کر سکتا ہے، لیکن جیسے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ''قرآن کی آیت'' ہے، تو مومن کی کیفیات یکسر بدل جاتی ہیں۔ وہ لرز اٹھتا ہے اور اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کلام الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ یہ رویہ اس بات کی علامت ہے کہ دین میں ''کون کہہ رہا ہے'' کی اہمیت ''کیا کہا جا رہا ہے'' سے کہیں زیادہ ہے۔ کلام کی تفہیم اور اس کی قدر و قیمت کا انحصار بڑی حد تک قائل کی شخصیت اور اس کے علمی مرتبے پر ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی محفل میں ایک شعر پڑھا جائے اور حاضرین اس کی معرفت پر سر دھنیں، لیکن بعد میں انکشاف ہو کہ وہ شعر جدید دور کے کسی سطحی شاعر کا ہے، تو ایک باذوق شخص فوراً اپنی حس لطافت پر نادم ہوتا ہے کہ اس نے ایک عام سی بات میں گہرائی کیوں تلاش کی۔ اس کے برعکس، اگر کسی شعر کو پہلی نظر میں کمزور سمجھ کر مسترد کر دیا جائے، لیکن پھر بتایا جائے کہ یہ ''خدائے سخن'' میر تقی میر کا کلام ہے، تو قاری فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیتا ہے۔ وہ اپنی فہم پر شک کرتا ہے کہ اگر میر نے یہ بات کہی ہے تو یقیناً اس میں کوئی پوشیدہ نکتہ یا فنی باریکی ہو گی جو میری نظر سے اوجھل رہی۔ گویا قائل کی سند اور اس کا مرتبہ کلام کو وہ وزن عطا کرتا ہے جو الفاظ کے لغوی مفہوم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

سند اور دینی روایت کا تسلسل

دین اسلام میں ان نظریے کی مکمل جھلک سلسلۂ اسناد میں نظر آتی ہے۔ احادیث مبارکہ کی حفاظت کے لیے محدثین نے جو نظام وضع کیا، اس کی بنیاد اسی پر ہے کہ علم ''کس سے'' حاصل کیا جا رہا ہے۔ ایک طالب علم اپنے استاد سے اور وہ اپنے استاد سے روایت کرتا ہے، یہاں

تک کہ یہ نورانی سلسلہ براہ راست نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس تک جا پہنچتا ہے۔ یہ دینی روایت محض معلومات کی منتقلی کا نام نہیں، بلکہ ایک ایسا زندۂ جاوید تسلسل ہے جو علم کو وقار اور ثقاہت (authenticity) عطا کرتا ہے۔ پڑھنے والا ہو یا پڑھانے والا، دونوں خود کو ایک عظیم الشان علمی روایت کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس احساس نسبت کو اکبر الٰہ آبادی نے ایک خوب صورت تمثیل میں پرویا ہے:

اک برگ گل کہے گا کہ ہم گل کے جزو ہیں
تم خود کو کیا کہو گے کہ کس کل کے جزو ہیں!

یہ شعر اس فکری بحران کی طرف اشارہ ہے جہاں آج کا انسان اپنی جڑوں اور اپنی اصل (الکل) سے کٹ کر تنہا رہ گیا ہے۔ جب تک ایک پتی (برگ گل) پھول سے جڑی ہے، وہ معتبر ہے، اسی طرح جب تک ایک فرد اپنی علمی و دینی روایت سے جڑا ہے، اس کا وجود معنی خیز ہے۔

تحریک و حرکت کا فتنہ اور احتیاط کی حکمت

عصر حاضر میں ایک مخصوص طرز گفتگو نہایت مقبول ہو چکا ہے، جس کا محور محض ''اُٹھو، جاگو اور کام کرو'' جیسے نعرے ہیں۔ مذہبی جماعتوں اور روایتی علمی مراکز کی مبینہ ناکامی کا ڈھنڈورا پیٹ کر نوجوانوں کو مسلسل تحریک، فعالیت (activism) اور مہم جوئی پر اکسایا جا رہا ہے، گویا اس ہنگامہ آرائی سے پیچھے رہنا کوئی گناہ کبیرہ ہو۔ حقیقت دین یہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر مسئلہ صرف حرکت کا متقاضی نہیں ہوتا۔ بعض حالات میں سکون، خاموشی اور کنارہ کشی (retreat) ہی سب سے بڑی دانش مندی ہوتی ہے۔ دین ہمیں سکھاتا ہے کہ فتنوں کے دور میں بعض اوقات بے عمل رہنا یا کسی تحریک کا حصہ نہ بننا ہی سب سے بڑی حکمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے فتنے کی خبر دی ہے جس میں دوڑنے والے سے چلنے والا، اور چلنے والے سے کھڑا رہنے والا بہتر ہوگا، یہاں تک کہ اگر کھڑا رہنے والا بھی خطرہ محسوس کرے تو وہ بیٹھ جائے یا لیٹ جائے۔ اس کا مفہوم واضح ہے کہ فتنوں کے ہیجان میں نجات کی راہ عمل میں نہیں بلکہ احتیاط اور تحفظ میں پوشیدہ ہے۔ ''الترغیب والترھیب'' کی

ایک روایت میں ارشاد ہے: **(کونوا اخلاس بیوتکم)** ''اپنے گھروں کے کونے کا ٹاٹ بن جاؤ۔'' یہ طرز عمل کسی فرار یا بزدلی کا نام نہیں، بلکہ ایک گہرے فکری اور روحانی تدبر کا ثمر ہے۔

جدید مغربی انسان مسلسل ایک مضطرب وجود (agitative self) کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ وہ ہر وقت رد عمل، احتجاج اور کسی نہ کسی نئی مہم کا حصہ بننے پر مجبور ہے۔ اس کے برعکس، اللہ کے اولیاء کی زندگی میں سکون، توازن اور وقار پایا جاتا ہے۔ وہ شور کے بجائے سکوت میں جیتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی حق و باطل کے درمیان دھند چھائی، چاہے وہ صحابہ کا دور ہو، تاتاریوں کا فتنہ یا حالیہ دور میں شام کا المیہ، ایسے حالات میں نبوی ہدایت یہی رہی ہے: **(فاعتزل تلک الفرق کلھا)**'' ان تمام گروہوں سے الگ ہو جاؤ۔'' بعض اوقات کسی فریق کا انتخاب کرنا یا دو طرفہ (bipartisan) ہونا دانش مندی نہیں ہوتی، بلکہ حق کی تلاش کے لیے انتظار اور خلوت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے وقت کی نشان دہی فرمائی جب انسان اپنے جلیس (قریبی ساتھی) سے بھی محفوظ نہیں رہے گا۔

اس گھمبیر صورت حال میں فتنے کے دور کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ آدمی خود کو شور و غوغا سے الگ رکھے۔ ہر دعوت قیام کے جواب میں ایک بنیادی سوال اٹھایا جائے: ''کیا یہ قیام کا وقت ہے یا سکوت کا؟'' کیونکہ دین صرف ایکشن اور ایجی ٹیشن کا نام نہیں ہے۔ بعض اوقات پسپائی، خاموشی اور قلب کا سکون ہی ایمان کی سب سے بڑی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ تاریخ انسانی میں ایسے ادوار بھی آئے جن کی بابت رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی متنبہ فرما دیا تھا کہ جب فتنے اس شدت سے پھیل جائیں کہ حق و باطل کے درمیان تمیز دشوار ہو جائے، تو اس وقت سب سے بڑی دانش دست برداری (retreat) میں ہے۔ نبوی فرمان کہ ''اپنی تلوار کو پتھر پر مار کر توڑ دو'' محض ایک علامتی حکم نہیں بلکہ فکری اور رویے میں تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ جس فتنے میں قتل و غارت گری ہی مقصود بن جائے، وہاں ہتھیار ڈال دینا ہی سب سے بڑی فتح ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک صحابی کو جب ان کے گوشہ نشین ہونے پر ٹوکا گیا تو انہوں نے لکڑی کی تلوار نکال کر دکھائی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم پر اپنی آہنی تلوار توڑ دی ہے۔ اسی طرح ''الترغیب والترھیب'' کی روایت کے مطابق، آپ ﷺ نے فتنوں کے دور میں ظلم کے سامنے سینہ سپر ہونے کے بجائے ''خیر ابنی آدم'' (آدم کے دو بیٹوں میں سے خیر والے یعنی ہابیل) کی روش اپنانے کا حکم دیا، جس نے فتنہ روکنے کے لیے اپنی جان تو دے دی مگر فتنے کو مہمیز نہ دی۔

موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ خاموشی، جو کبھی ایک فضیلت تھی، اب کمزوری سمجھی جانے لگی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: **(اللسان فیھا اشد من وقع السیف)** (سنن ابی داؤد: ۴۲۶۵) ''اس فتنے میں زبان کا وار تلوار کے وار سے زیادہ مہلک ہوگا'' مگر آج ہر شخص معاملے کی نزاکت اور دینی بصیرت سے عاری ہونے کے باوجود، ہر موضوع پر لب کشائی ضروری سمجھتا ہے۔ جدید ذہن اس فریب میں مبتلا ہے کہ اسے ہر حال میں کچھ بولنا، لڑنا اور کوئی نہ کوئی محاذ کھولنا ہے۔

مذہبی نوجوان اور سائبر جہاد کا سراب

یہاں خاص طور پر ان مذہبی نوجوانوں سے مخاطبت ہے جو ایک جذباتی ہیجان کا شکار ہیں۔ الحاد، لبرل ازم اور مارکس ازم کے خلاف مورچہ زن ان نوجوانوں سے میرا سوال ہے کہ: ''بھائی، آپ کی علمی اساس کیا ہے؟'' جن نوجوانوں کو نہ اپنی دینی روایت کا گہرا فہم ہے، نہ علمی تاریخ کا ادراک، اور نہ ہی ان ازمز (isms) کی زبان اور منطق سے واقفیت ہے، وہ آخر کس بنیاد پر سائبر مجاہد بن کر میدان میں اتر آئے ہیں؟ یہ ''کی بورڈ'' کی جنگیں لائکس اور کمنٹس کا تعاقب، مغالطوں پر مبنی جذباتی ویڈیوز کیا واقعی دین کی خدمت ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دین کی خدمت سے زیادہ انا کی تسکین کا سامان معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس بے سمتی کی جنگ کا انجام نہایت ہولناک نکل رہا ہے۔ سینکڑوں نوجوان اپنی ہی جہالت کے باعث ان فکری الجھنوں میں ایسے الجھے کہ بالآخر دین سے ہی دور ہو گئے، اور بہت سے تو صریحاً الحاد کی تاریک کھائیوں میں جا گرے۔

انکار کی نفسیات: شبہات یا شہوات؟

آج کل والدین کی جانب سے یہ دہائی کثرت سے سننے کو ملتی ہے کہ ان کی اولاد راہ ہدایت سے بھٹک چکی ہے۔ ایسے نوجوانوں سے گفتگو کرتے ہوئے داعی کا دل بھی ہچکچاتا ہے۔ یہ اندیشہ دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں ہمارا جواب اس کی ضد میں مزید پختگی کا باعث نہ بن جائے اور وہ یہ گمان نہ کر بیٹھے کہ اس نے ''ایک اور مولوی کو پچھاڑ دیا۔'' حقیقت یہ ہے کہ جو حق کو قبول نہ کرنے کا تہیہ کر چکا ہو، اسے دنیا کی کوئی دلیل مطمئن نہیں کر سکتی۔ ایسے لوگ کسی فکری غلط فہمی (intellectual confusion) کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ شعوری انکار کی حالت میں ہوتے ہیں۔ دور حاضر کا اصل المیہ شبہات (doubt) نہیں بلکہ 'شہوات' (desires) ہیں۔ انسانی دل مادی لذتوں کے اسیر ہو چکے ہیں اور سوشل میڈیا نے ہوس پرستی کے ایسے دروازے کھول دیے ہیں کہ انسان حق کو جانتے ہوئے بھی اس لیے نہیں مانتا کہ اسے اپنی خواہشات کی قربانی دینی پڑے گی۔

دجالی فتنے اور خود اعتمادی کا سراب

رسول اللہ ﷺ نے دجال کے فتنے سے دور رہنے کی تاکید فرماتے ہوئے ایک نفسیاتی گرہ کھولی ہے:

(من سمع بالدجال فلینا عنہ فواللہ ان الرجل لیاتیہ وھو یحسب انہ مومن فیتبعہ مما یبعث بہ من الشبھات او لما یبعث بہ من الشبھات۔) (سنن ابی داؤد: ۴۳۱۹)

''جو شخص دجال کے بارے میں سنے، وہ اس سے دور ہو جائے۔ اللہ کی قسم ایک شخص یہ گمان کرتے ہوئے دجال کے پاس جائے گا کہ میں تو مؤمن ہوں، لیکن وہ اس کے شبہات سے متاثر ہو کر اس کا پیروکار بن جائے گا۔''

آج ہم اپنی آنکھوں سے یہ اذیت ناک منظر دیکھ رہے ہیں کہ وہ نوجوان جو خود کو فکری طور پر مستحکم سمجھتے تھے، یوٹیوب کی محض ایک ویڈیو یا کسی ملحد کے ایک سطحی سوال پر لرز اٹھتے ہیں۔ ان کا ایمان ریت کی دیوار ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد جذبات پر تھی، علم پر نہیں۔

ایسے پُرآشوب حالات میں شریعت کا اولین مطالبہ جارحانہ مہم جوئی نہیں بلکہ حفاظت خود اختیاری ہے۔ قرآن حکیم کا واضح حکم ہے:

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (سورۃ التحریم: آیت:٦)

''اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ۔''

فتنے کے اس دور میں دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر ایرے غیرے سے مناظرے کرنے کے بجائے علمائے ربانی، اہل دل اور راسخون فی العلم کی پناہ تلاش کرے۔ ان کے سائے میں بیٹھ کر اپنی عقل کی تہذیب اور قلب کی تربیت کرے، کیونکہ تنہا راستہ چلنے والا شیطان کا آسان لقمہ ہوتا ہے۔

یہ ایک بنیادی سوال ہے کہ آخر ہمیں یہ اختیار کس نے دیا کہ ہم بن بلائے ہر نظریاتی جنگ کے سپاہی بن جائیں! کس نے یہ ذمہ داری ہم پر ڈالی ہے کہ ہر ملحد اور ہر مستشرق کو جواب دینا ہمارا ہی کام ہے؟ ہر سوال میں الجھنا اور ہر بحث میں اکیلے کود پڑنا دانش نہیں بلکہ خبط خود نمائی ہے۔ دین کی خدمت جذبات کے بے لگام اظہار سے نہیں، بلکہ اساتذہ کی نگرانی میں علمی استقامت پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔

تزکیہ اور اقامت دین: متضاد نہیں، تکمیلی پہلو

عصر حاضر میں دین کی تعبیر و تفہیم کے حوالے سے چند عجیب و غریب تضادات نے جنم لیا ہے۔ ایک طبقہ دین کو محض انفرادی تزکیۂ نفس تک محدود کر کے پیش کر رہا ہے، جبکہ دوسرا گروہ صرف اقامت دین یعنی اجتماعی نظام کے نفاذ کو ہی کل دین قرار دیتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے کا حریف بنا کر ایک غیر متوازن بیانیہ تشکیل دیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تزکیۂ نفس اور اقامت دین ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ دین جہاں انسانی باطن کی تطہیر چاہتا ہے، وہیں وہ اجتماعی زندگی کو بھی عدل، خیر اور توحید کے آفاقی اصولوں پر استوار کرنے کا داعی ہے۔

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج سطحی مطالعے اور ناپختہ فہم کی بنیاد پر امت کو اقامت دین کا پروگرام دینے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ تو

دینی اصطلاحات کی گہرائی کا علم ہے اور نہ ہی وہ ان کا درست تلفظ ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں، مگر دعویٰ یہ ہے کہ وہ پوری امت کی فکری رہنمائی کر رہے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی قسم کی آزادی پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!

آج صورت حال یہ ہے کہ چند لفظی ہیر پھیر سیکھ کر لوگ خود کو مفکر امت تصور کرنے لگے ہیں، حالانکہ وہ تزکیے کے اصل مفہوم اور اقامت دین کے وسیع دائرے سے کلی طور پر ناواقف ہیں۔ دین کا اصل تقاضا یہ ہے کہ انفس (فرد کی ذات) اور آفاق (معاشرہ و ریاست) دونوں جگہ اللہ کا غلبہ قائم ہو۔ تزکیۂ نفس بھی ناگزیر ہے اور ایک عادلانہ معاشرے کا قیام بھی ضروری ہے۔ یہاں اصل علمی بحث یہ نہیں کہ ان میں سے کیا کیا جائے، بلکہ اصل سوال آغاز اور ترتیب کا ہے کہ سفر کہاں سے شروع ہو!

اس ترتیب عمل کو سمجھنے کے لیے اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر ایک مکمل فلسفہ پیش کرتا ہے:

خدا کے کام دیکھو، بعد کیا ہے اور کیا پہلے!
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غار حرا پہلے!

غار حرا وہ مقام تزکیہ ہے جہاں نبوت کی ابتدا ہوئی اور بدر وہ میدان عمل ہے جہاں دین کا اجتماعی غلبہ ظاہر ہوا۔ گویا جب تک باطن غار حرا کی روشنی سے منور نہ ہو، میدان بدر میں کامیابی کا خواب ادھورا ہے۔ کسی دانشور کا یہ قول نہایت پُر مغز ہے کہ:

There cannot be an Islamic state without an inner Islamic state

''ایک داخلی اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر خارجی اسلامی ریاست کا وجود ناممکن ہے۔''

جب تک فرد کے فکر و شعور اور قلب و نظر میں دین کی حاکمیت قائم نہیں ہوتی، اجتماعی سطح پر اسلامی نظام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک بڑی فکری غلط فہمی ہے کہ تزکیہ پر زور دینے والے اقامت دین کے مخالف ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر مؤمن کی قلبی خواہش غلبۂ دین ہی ہے، اختلاف محض منہج اور 'طریق کار' کا ہے۔ مقصد سب کا ایک ہی ہے: کلمۃ اللہ کی سربلندی۔

تحریکیت بمقابلہ عبادت: ایک مصنوعی تصادم

افسوس ناک امر یہ ہے کہ دور حاضر میں عبادت اور تحریکیت کے درمیان ایک مصنوعی جھگڑا کھڑا کر دیا گیا ہے۔ کچھ حلقوں کی جانب سے روایتی دینی شعائر اور عبادات کو ''پوجا پاٹ'' کہہ کر استخفافی انداز میں پیش کیا جاتا ہے، یہ کہہ کر کہ مولویوں نے قوم کو محض تسبیح و مناجات میں الجھا کر اصل مقصد یعنی سیاسی غلبے سے دور کر دیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا اسلامی انقلاب ہو گا جو بندگی کی توہین اور عبادات کی تحقیر کی بنیاد پر برپا کیا جائے گا؟ بندگی کا پہلا اور بنیادی تقاضا ہی پرستش ہے، اگر بندگی کی یہ روح ہی مفقود ہو جائے تو پھر تحریک محض ایک بے جان سیاسی ڈھانچا بن کر رہ جاتی ہے۔ آج کل ایک مخصوص طبقہ روشن خیالی کے زعم میں نوجوانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ: '' دین کا اصل مفہوم تو امت سے چھپا لیا گیا تھا، جواب ہم واضح کریں گے۔'' یہ نام نہاد دانشور بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دین محض ایک سسٹم (نظام) کا نام ہے، جبکہ عبادات و تزکیہ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

پڑھے لکھے نوجوان ان کے سحر انگیز اسلوب اور جدید سسٹم کی اصطلاحات سے متاثر ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید صدیوں سے چلے آنے والے اکابر، فقہاء اور صوفیاء دین کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔ یہ دانشور حضرات جس سسٹم کا ڈھول پیٹ رہے ہیں، وہ درحقیقت دین کو محض ایک مادی اور سیاسی نظریے (ideology) میں بدلنے کی شعوری یا لاشعوری کوشش ہے، جس میں روح کا کوئی حصہ نہیں۔

عصری تعلیم اور ذہنی پستی (Dumbing Down Effect)

علم اور ادب کے باہمی تعلق کے حوالے سے ایک نہایت تشویش ناک پہلو وہ فکری تنزلی ہے جو دور حاضر کے تعلیمی منظر نامے میں رچ بس گئی ہے۔ وہ لوگ جو دینی یا دنیاوی کسی بھی نظم تدریس سے وابستہ ہیں، ان کا یہ عمومی تجربہ ہے کہ حالیہ چند برسوں میں طلبہ کی ذہنی استعداد جس تیزی سے گری ہے، اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔

یہ جدید عہد کا Dumbing Down Effect ہے، جہاں ہر نیا تعلیمی سال پچھلے سے زیادہ فکری پستی کا شکار نظر آتا ہے۔ یونیورسٹیوں کی اصل صورت حال یہ ہے کہ سائبر ٹیکنالوجی نے ذہن کو مفلوج کر دیا ہے۔ معلومات کی بہتات تو ہے مگر ادراک و تفہیم کا کال پڑ چکا ہے۔ شعور کی سطح مسلسل نیچے جا رہی ہے اور اس کے ساتھ ادب کا جنازہ بھی نکل چکا ہے۔

کثرتِ الفاظ اور فقدان معنی

امام عبداللہ بن مبارک کا قول اس مخدوش صورت حال میں تازیانے کا کام کرتا ہے کہ: ''ہم کثیر علم کے مقابلے میں تھوڑے سے ادب کے زیادہ محتاج ہیں''۔ آج ہمارے گرد و پیش میں الفاظ کا ہجوم مگر معانی کا قحط ہے۔ ہم اس دور میں داخل ہو چکے ہیں جس کی بابت رسول اللہ ﷺ نے پہلے ہی متنبہ فرما دیا تھا کہ: ''ہم ایک ایسے دور میں ہو جہاں فقہاء زیادہ اور خطباء کم ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب خطیب بہت ہوں گے اور فقیہہ (علم کی گہرائی رکھنے والے) کم۔''

آج چرب زبانی اور لسانی مہارت کو ہی کامیابی کی معراج سمجھ لیا گیا ہے، جبکہ بصیرت اور تہذیب کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے لیے جس سب سے بڑے خطرے کی نشان دہی فرمائی، وہ **''علیم اللسان منافق''** (زبان دراز اور فصیح بیان منافق) تھا۔ المیہ یہ ہے کہ لوگوں کی زبان تو شعلہ بار ہے مگر ان کا دل سوز ایمانی اور بندگی کی تڑپ سے خالی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اس فکری و روحانی تضاد کو ایک ہی مصرعے میں سمو دیا ہے: ''ہے زباں گرم، قلب ٹھنڈا ہے!''

یہ محض ایک مصرع نہیں بلکہ پوری جدید تہذیب کا نوحہ ہے، جہاں تقریر و خطاب کی گرمی تو موجود ہے مگر وہ حرارت قلبی مفقود ہے جو انسان کو اللہ کے سامنے جھکا دے اور اسے باادب بنا دے۔ سبحان اللہ! رب زبان تو خوب رواں ہے، مگر دل میں وہ سوز ایمانی مفقود ہے جو کردار کو بدل دے۔ دو دو، تین تین گھنٹوں پر محیط طویل تقریریں، سحر انگیز لب و لہجہ اور اسٹیج پر ایسی بھرپور پرفارمنس دکھائی جاتی ہے کہ حاضرین دم بخود رہ جاتے ہیں۔ اس تمام تر فکری و تبلیغی مہم کے پس پردہ ایک ہولناک حقیقت پوشیدہ ہے۔ ان خطباء نے اپنا پورا بیانیہ اسلاف اکابر کی فہم سے رشتہ توڑ کر قائم کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب تک نئی نسل اپنے دینی ورثے اور علمائے ربانی کی روایت سے جڑی رہے گی، ان کی فکری انفرادیت کا جادو نہیں چل سکے گا۔ لہٰذا، ان کی کامیابی کا دارومدار نوجوانوں کو اپنے اکابر سے بدگمان اور بے نیاز کر دینے میں ہی ہے۔

آج کل ایک مخصوص طبقہ نہایت مقبول ہے جو روزمرہ کی بنیاد پر یہ زہر نوجوانوں کے ذہن میں گھول رہا ہے کہ ان کی بربادی کے اصل ذمہ دار تین طبقے ہیں: والدین، اساتذہ اور مولوی حضرات۔ گویا نئی نسل کی تمام تر خرابیوں کا ملبہ انہی تین طبقات پر ڈال دیا گیا ہے۔ یہ بیانیہ اب محض ایک رائے نہیں بلکہ باقاعدہ ایک تحریکی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچ رہا کہ اگر معاشرے سے ان تین ستونوں کا احترام ختم ہو گیا، تو دینی و سماجی اقدار کی پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ یہ صورت حال عین اس نبوی پیش گوئی کے مطابق ہے: **(ان تلد الامته ربتها)** (صحیح مسلم:۸) ''کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے گی۔'' یعنی اقدار الٹ جائیں گی، مراتب کا فرق مٹ جائے گا اور رشتوں کا تقدس پامال ہو جائے گا۔

قدیم تہذیبی اصولوں (جیسے کنفیوشس کے پانچ بنیادی سماجی تعلقات) سے اسلامی تعلیمات تک معاشرے کا توازن پانچ رشتوں پر قائم ہے: والدین و اولاد، بڑے و چھوٹے بہن بھائی، شوہر و بیوی، حاکم و رعایا، استاد و شاگرد۔ آج جدیدیت اور نام نہاد مذہبی دانشوری کی چادر اوڑھ کر ان تمام رشتوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہی نوجوان جو دین کی تلاش میں نکلے تھے، اب اپنے ہی محسنوں (والدین، اساتذہ اور علماء) کے خلاف صف آرا ہیں۔

یہ صورت حال قلب و نظر کے لیے شدید بے چینی کا باعث ہے۔ اسی لیے اب اس امر کی شدید حاجت ہے کہ ادب پر زور دیا جائے، کیونکہ علم اگر ادب سے عاری ہو جائے تو وہ روح کے لیے زہر بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی کرب کا اظہار یوں کیا تھا:

نوجوانے را چو بینم بے ادب
روز من تاریک می گردد چو شب

''جب میں کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں، تو میرا دن رات کی طرح تاریک ہو جاتا ہے۔''

انہوں نے سچ کہا تھا کہ جب نوجوان بے ادب ہو جائے تو دن کی روشنی بھی شب کی تاریکی میں بدل جاتی ہے۔ آج کے دور کا سب سے ہولناک المیہ ادب کا تیزی سے مفقود ہونا ہے۔ وہ احترام باہمی جو کبھی شاگرد کو استاد سے، اولاد کو والدین سے اور اصاغر کو اکابر سے جوڑے رکھتا تھا، اب قصۂ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دل سے محبت رخصت ہو جائے تو وفا اور لحاظ کی خوشبو بھی باقی نہیں رہتی۔ آج زبان میں وہ رعایت رہی نہ لہجے میں وہ جھکاؤ۔ لوگ کوئی لفظ بولنے سے پہلے اس کے اثرات پر بھی غور نہیں کرتے۔

کچھ روز قبل چند احباب کی گفتگو کے دوران جب یہ جملے کانوں میں پڑے کہ ''میں فلاں کا follower ہوں'' اور ''میں فلاں کو فالو کرتا ہوں'' تو اس فکری تنزلی پر دل لرز اٹھا۔ وہ امت جس کے نوجوان کبھی امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے جلیل القدر ائمہ کے پیروکار ہونے پر فخر کرتے تھے، آج یوٹیوبرز اور ٹک ٹاکرز کی پیروی کو اپنا اعزاز سمجھ رہی ہے! یہ بلندی سے پستی کی طرف ایک ایسا سفر ہے جس کی ہولناکی کا شعور مفقود ہو چکا ہے۔ لوگ ان الفاظ کے مفہوم پر غور نہیں کرتے کہ وہ کس کو اپنا مقتدا (followed) بنا رہے ہیں۔ کیا کبھی کسی نے سوچا کہ یہ سب محض تفریح نہیں بلکہ باقاعدہ ایک کھیل ہے؟ ایک ایسا کھیل جو دن دہاڑے آپ کے شعور کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے۔

نائٹ کلبز اور منشیات کی تباہ کاریاں تو سب کو نظر آتی ہیں، لیکن اس ذہنی یلغار پر کسی کی توجہ کیوں نہیں جاتی؟ یہ ڈیجیٹل فالوورشپ دراصل ایک گہرا منصوبہ ہے جو آپ کے رشتوں

کو کاٹنے، آپ کی شناخت مٹانے اور آپ کی روحانی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ یہ محض اسکرین پر نظر آنے والا کوئی تماشا نہیں، بلکہ ایک منظم عمل ہے جو ہماری اقدار اور معاشرتی ترتیب کو خاموشی سے پیوند خاک کر رہا ہے۔ جب معیار کامل (Ideals) بدل جاتے ہیں، تو پوری تہذیب کا رخ بدل جاتا ہے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہم کس کے پیچھے چل رہے ہیں اور ہماری منزل کیا ہے!

فقہ اور فکر: ایک مصنوعی تقسیم کا فتنہ

عصر حاضر کا ایک عجیب تضاد فقہ اور فکر کے درمیان قائم کی جانے والی مصنوعی binary ہے۔ آج کل یہ تاثر عام کیا جا رہا ہے کہ علمائے کرام اور مولوی حضرات سے محض چھوٹے موٹے فقہی مسائل پوچھ لیے جائیں، بلکہ فکری گفتگو کے لیے ان نام نہاد مفکرین کی طرف رجوع کیا جائے جو خود کو اسلامی مفکر کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ گویا دین کا فہم اور بصیرت کسی ایسی مخصوص مخلوق کے پاس آ گئی ہے جو راسخ علم سے عاری مگر جدید اصطلاحات سے لیس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ''فکر'' کا لفظ ایک فیشن بن چکا ہے۔ یہ اصطلاح دراصل استعماری دور کی پیداوار ہے، جسے دین کے حقیقی اور راسخ علم سے انحراف کے لیے استعمال کیا گیا۔ بار بار ''مگر اسلامی'' کی گردان تو کی جاتی ہے، مگر کوئی یہ نہیں بتاتا کہ علوم نبوت کی روشنی میں اس اصطلاح کا وجود کہاں ہے؟

دنیاوی علوم میں تو ہر شخص کی ایک واضح شناخت ہوتی ہے، جیسے سائیکالوجسٹ، بیالوجسٹ یا جیالوجسٹ۔ اسی طرح دینی میدان میں بھی محدث' فقیہہ' مفسر اور متکلم جیسے پختہ عنوانات موجود ہیں۔ آج ہم '' اسلامک اسکالر'' اور ''ریسرچ اسکالر'' جیسی مبہم اور من گھڑت شناختوں کے جنگل میں گھر چکے ہیں۔ ان خود ساختہ اسکالرز سے اگر کوئی پوچھے کہ آپ کی علمی سند کیا ہے، آپ کا استاد کون ہے، اور آپ کی علمی نسبت کس روایت سے ہے، تو جواب میں خاموشی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ بس ایک مائیک اور سوشل میڈیا کا پلیٹ فارم میسر ہے، جس کے بل بوتے پر یہ حضرات ہر مسئلے پر فتویٰ دینے اور ہر میدان میں اپنے فکر کا لوہا

منوانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ یہ سب دراصل فقہ کی اہمیت کو کم تر دکھانے اور اپنی بے بنیاد سوچ کو بلند مقام دینے کی ایک شعوری کوشش ہے۔

دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ فکری سوالات ان مفکرین سے کیے جائیں، حالانکہ اصل علم اور حقیقی معرفت تو فقہ ہی میں پوشیدہ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ نے فقہ کی جو تعریف فرمائی، وہ علم کی گہرائی کا سمندر ہے:

(معرفة النفس ما لها وما عليها)

''انسان کو یہ جاننا کہ اس کے لیے کیا ہے اور اس پر کیا ذمہ داری ہے۔''

یہی تفقہ ہی حقیقی علم ہے جو انسان کو اپنی بندگی کا شعور عطا کرتا ہے۔ اگر فقہ کو محض معمولی مسائل کا مجموعہ قرار دے کر مسترد کر دیا جائے اور فکر کے نام پر لایعنی باتوں کو علم بنا کر پیش کیا جائے، تو دین کی اصل روح فنا ہو جائے گی۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جب بنیادیں ہی کھوکھلی ہوں گی تو اس پر کھڑی ہونے والی فکر کی عمارت کتنی دیر پائیدار رہ سکے گی!

متن سے تصویر تک: انسانی شعور کی تبدیلی

عصر حاضر کا ایک نہایت عمیق اور سنگین فتنہ ''تصویر'' کا غلبہ ہے۔ ہم ایک ایسی بڑی تبدیلی سے گزر رہے ہیں جہاں انسانی تہذیب متن (text) کے علمی حصار سے نکل کر تصویر (image) کے سحر میں منتقل ہو چکی ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی تبدیلی معلوم ہوتی ہے، مگر اس نے انسانی شعور (consciousness) اور اس کے خارجی اظہار، یعنی ہماری تہذیب و ثقافت پر نہایت پیچیدہ اور دوررس اثرات مرتب کیے ہیں۔ تصویر چاہے جامد (still) ہو یا متحرک (moving) اس کی فتنہ سامانیوں سے آج کوئی شعبۂ زندگی محفوظ نہیں۔ تصویر کا سب سے مہلک پہلو یہ ہے کہ یہ انسان کو غیر فعال (Passive) بنا دیتی ہے۔ جب ہم کسی تصویر یا ویڈیو کے سامنے ہوتے ہیں، تو ہمارا تنقیدی شعور مفلوج ہو جاتا ہے۔ ہم محض ایک تماشائی بن کر اس کے اثرات کو بلا سوچے سمجھے جذب کرنے لگتے ہیں۔

آج کی بڑی بڑی مشہور شخصیات اور celebrities کی مقبولیت کا طلسم صرف تصویر ہی کا مرہون منت ہے۔ اگر آپ کسی نام نہاد اسٹار کی ویڈیو بند کر کے صرف اس کی آڈیو

(گفتگو) سنیں، تو آپ کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی باتوں میں کتنا وزن ہے اور وہ عملی و فکری اعتبار سے کتنے کھوکھلے ہیں۔ یہ امیج کلچر کا جادو ہے جو سطحی باتوں کو بھی معتبر بنا کر پیش کرتا ہے۔ فرانسیسی مفکر Guy Debord نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب The Society of the Spectacle میں اس صورت حال کا نہایت گہرا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اگر اس اصطلاح کا ترجمہ کیا جائے تو ہم اسے ''تماش بین سماج'' کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ معاشرہ ہے جہاں ہر احساس، ہر پیغام اور ہر خیال کو ایک امیج کی صورت دے دی گئی ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں مقیم ہیں جہاں حقیقت کے بجائے اس کی تصویر زیادہ اہم ہو چکی ہے۔ مولانا روم نے صدیوں پہلے اس نفسیاتی بچپن کی کیا خوب نقشہ گری فرمائی تھی:

پس نکو گفت آن حکیم کامیار
کہ تو طفلی خانۂ پُر نقش و نگار

''کیا خوب بات کہی ہے اس سمجھ دار اور دانا شخص (حکیم سنائی) نے کہ تو ابھی بچہ ہے اور یہ دنیا محض بچوں کا گھر ہے جو نقش و نگار سے سجا ہوا ہے۔''

ہم اس مادی اور تصویری دنیا کے نقش و نگار میں ایسے الجھے ہیں کہ حقیقت ابدی سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اگرچہ باری تعالیٰ نے اس کائنات کو فطری زینت عطا فرمائی ہے، مگر جدید ٹیکنالوجی نے اس کے متوازی ایک ایسی مصنوعی دنیا کھڑی کر دی ہے جس کی جمالیاتی کشش اور چمک دمک غیر معمولی ہے۔ یہ ڈیجیٹل دنیا نہ صرف سجی سنوری ہے بلکہ نہایت سستی، بلکہ تقریباً مفت ہو چکی ہے۔ آج موبائل فون محض ایک آلہ نہیں رہا بلکہ لذتوں کی ایک ایسی متحرک فیکٹری بن چکا ہے جو ہر وقت آپ کی دسترس میں رہتی ہے اور آپ کے شعور کو مسلسل ایک مخصوص ہیجانی کیفیت میں مبتلا کیے رکھتی ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جو انسان کو ''لذتوں کی مشینی دوڑ'' (Hedonistic Treadmill) میں جھونک دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بے سمت تگ و دو ہے جس میں انسان پاؤں تو تیزی سے مار رہا ہوتا ہے مگر کہیں پہنچ نہیں پاتا، وہ تھک کر نڈھال تو ہو جاتا ہے مگر رک نہیں سکتا، کیونکہ اس راستے پر منزل کا وجود ہی نہیں۔

لذتوں کا یہ طوفان اس قدر شدید ہے کہ اب انسان تصویر اور ویڈیو کے اس حد تک عادی ہو چکے ہیں کہ کیمرے کی غیر موجودگی میں ان کی شخصیت ہی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ کچھ لوگ تو اب زبان ہی تب کھولتے ہیں جب انہیں یقین ہو جائے کہ ان کا ہر لفظ ریکارڈ ہو رہا ہے۔ یہ کوئی مزاحیہ تبصرہ نہیں بلکہ ایک تلخ سماجی حقیقت ہے کہ کیمرہ اب بہت سے افراد کے لیے اظہار کی آکسیجن بن چکا ہے۔ ان کا وجود صرف اسی وقت معتبر ہوتا ہے جب وہ لینز کی گرفت میں ہوں۔ ہم نے شعوری طور پر ایک ایسی تماش بین، تصویر زدہ اور لذت پرست دنیا کا انتخاب کر لیا ہے جہاں مادی کشش کے سامنے انسان کی روحانیت دم توڑ رہی ہے۔ اس فکری و اخلاقی دیوالیہ پن پر شاعر نے کیا خوب طنز کیا ہے:

دوزخ کے داخلے میں نہیں ان کو عذر کچھ
فوٹو کوئی لگا دے جو ان کا بہشت میں

یہ شعر اس عہد کی عکاسی کرتا ہے جہاں انسان حقیقت سے زیادہ نمائش کا رسیا ہو چکا ہے، یہاں تک کہ وہ نمائش کی خاطر ابدی خسارے کا سودا کرنے پر بھی آمادہ ہے۔

مولانا یوسف بنوری نے برسوں پہلے ایک فکر انگیز مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا: ''علماء و مصلحین امت اور ان کے فتنے۔'' اس تحریر کا ایک کلیدی نکتہ ''ہر دل عزیزی'' (populatity) کا فتنہ ہے، جو آج کے دور میں غیر معمولی شدت اختیار کر چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

(ما ذئبان جائعان ارسلا فی غنم بافسد لها من حرص المرء علی المال والشرف لدینه) (سنن الترمذی: ۲۳۷۶)

''دو بھوکے بھیڑیے اگر بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ جتنا نقصان کریں گے، اس سے کہیں زیادہ نقصان انسان کے دین کو اس کی مال اور عزت کی حرص پہنچاتی ہے۔''

علماء نے 'حب دنیا' کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: حب مال اور حب جاہ (شہرت و منصب کی محبت) سوشل میڈیا، بالخصوص یوٹیوب، اور دونوں مہلک خواہشات کی تسکین کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ یہاں فالوورز، لائکس اور کمنٹس کی صورت میں جاہ

(شہرت) حاصل ہوتی ہے، اور دوسری طرف مونیٹائزیشن کے ذریعے ڈالرز کی ریل پیل سے مال کی ہوس پوری ہوتی ہے۔ یہ دوہرا جال انسانی نفس کو آہستہ آہستہ اپنی گرفت میں لے کر اسے ''ہر دل عزیزی'' کی نفسیاتی بیماری میں مبتلا کر دیتا ہے۔

آج کی ڈیجیٹل دنیا میں کامیابی کا واحد معیار وائرل ہونا اور داد سمیٹنا بن چکا ہے۔ فیس بک اور انسٹاگرام کی یہ کیفیت ہے کہ: 'من ترا حاجی بگویم' تو مرا ملا بگو (میں تمہیں حاجی کہوں، تم مجھے ملا کہو)۔ کسی نے محض ایک ادھار لیا ہوا جملہ یا شعر پوسٹ کیا اور فوراً مداحوں کی فوج ''کمال ہے'' اور ''استاد واہ واہ'' کے نعروں کے ساتھ ٹوٹ پڑی ماضی میں ایک عام انسان کو اپنی کسی خوبی پر داد یا شاباشی پانے کے لیے مہینوں یا برسوں انتظار کرنا پڑتا تھا، لیکن اب ہر گھنٹے بعد درجنوں لائکس اور تعریفی کمنٹس کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ آپ خود سوچیے کہ جس انسان کو ہر وقت مصنوعی بلندیوں پر بٹھایا جائے، کیا اس کا دماغ زمین پر رہے گا؟ کیا اس کا نفس فرعونیت کی حد تک نہیں پھول جائے گا؟ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ مسلسل ثناخوانی انسان کے تقویٰ اور عاجزی کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

اگر ہم نیوروسائنس کے پیچیدہ نظریات جیسے Dopamine کے اثرات کو ایک طرف رکھ کر صرف خالص انسانی مشاہدے کی بات کریں، تب بھی صورت حال نہایت خطرناک ہے۔ یہ محض ایک سرگرمی نہیں بلکہ ایک نشہ ہے جو انسان کو اپنی ذات کے حصار میں قید کر دیتا ہے۔ جب نمود و نمائش ہی زندگی کا مقصد بن جائے، تو اخلاص رخصت ہو جاتا ہے اور انسان محض ایک ایسی پراڈکٹ بن کر رہ جاتا ہے جس کی قیمت صرف اس کے ویوز سے لگائی جاتی ہے۔

ایک مشہور نظریہ ہے کہ Medium is the message یعنی جس ذریعے کو آپ اختیار کرتے ہیں، وہی آپ کے پیغام کی ہیئت اور اسلوب طے کرتا ہے۔ سوشل میڈیا پر آنے والے کو اب باقاعدہ یہ سکھایا جاتا ہے کہ: ''تمہارا Thumbnail ایسا ہیجانی ہو کہ لوگوں کی توجہ کھینچ لے۔''

''ویڈیو کے ابتدائی چند سیکنڈز میں وہ ہک (hook) ہو جو لوگوں کو رکنے پر مجبور کرے۔''

''تمہارا لب و لہجہ اور باڈی لینگویج اس میڈیم کی طلب کے مطابق پرفارمنس بن جائے۔''

یہ اب ایک مکمل سائنس ہے جس کے کورسز ہو رہے ہیں اور مارکیٹنگ کمپنیاں چل رہی ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی علمی زوال کی کیا خوب عکاسی کی تھی:

اک علم تو ہے بت بننے کا، اک علم ہے حق پہ مرنے کا
اس علم کی سب دیتے ہیں سند، اس علم میں ماہر کون کرے؟

آج کا المیہ یہی ہے کہ ہم بت بننے (یعنی خود کو ایک برانڈ کے طور پر پیش کرنے) کے علم میں تو ماہر ہو چکے ہیں، مگر حق پر مٹنے اور مٹ جانے کا وہ علم مفقود ہے جو انسان کو مٹی سے جوڑ کر بندہ بناتا تھا۔ عصر حاضر میں موٹیویشنل اسپیکنگ اور کامیابی (success) کا جو لٹریچر سیلاب کی طرح پھیل رہا ہے، وہ درحقیقت بُت بننے کا علم ہے۔ یہ علم انسان کو اپنی ذات کا معبود بنانے، خود کو مرکز کائنات سمجھنے اور اپنی انا کی پرستش کا سبق دیتا ہے۔ اس پورے بیانیے میں حق پر مٹنے کا حوصلہ، خود کو مٹانے کا جذبہ اور رضائے الٰہی کے لیے گمنامی قبول کرنے کا شعور کہیں نظر نہیں آتا۔

اس پورے لٹریچر کا مرکزی نعرہ (moto) یہ ہے: You can do it (تم سب کچھ کر سکتے ہو!)۔ یہ فلسفہ انسان کو باور کراتا ہے کہ اس کی کامیابی کی راہ میں واحد رکاوٹ وہ خود ہے، گویا دولت، نام اور شہرت کا نہ ملنا صرف اور صرف انسان کا ذاتی قصور ہے۔

انتہائی افسوس ناک امر یہ ہے کہ موجودہ مادی معاشرے میں غربت کو ایک اخلاقی جرم کی صورت دے دی گئی ہے۔ ہر دوسرا رہبر کامیابی (success guru) بل گیٹس کا یہ جملہ دہراتا نظر آتا ہے:

If you are born poor, it,s not your fault. But if you die poor, it,s your fault.

''اگر تم غریب پیدا ہوئے تو یہ تمہاری غلطی نہیں، لیکن اگر تم غریب مرے تو یہ سراسر تمہاری اپنی غلطی ہے۔''

یعنی غربت کو ایک اخلاقی جرم بنادیا گیا ہے، اور دولت کمانا گویا ایک مقدس ہدف۔ ہم نے اس معاشرے میں امارت کو عزت اور غریبی کو شرمندگی بنادیا ہے۔ اس سوچ نے دولت کے حصول کو ایک ''مقدس ہدف'' بنادیا ہے۔

ایک ایسا سماج تشکیل دے دیا گیا ہے جہاں امارت عزت کا معیار ہے اور غریبی شرمندگی کا نشان۔ جو لوگ کل تک اپنی حد سے بڑھی ہوئی دولت کی وجہ سے شرمندگی یا جھجک محسوس کرتے تھے، آج انہیں آئیکون اور آئیڈیل بنا کر نوجوانوں کے سامنے پیش کیا جارہا ہے۔

جب کامیابی کا پورا فلسفہ صرف مادیت اور اعداد و شمار کے گرد گھومنے لگے، تو انسان کے اندر سے قناعت، توکل اور شکر جیسے اعلیٰ اوصاف رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہ لٹریچر انسان کو ایک ایسی لامتناہی دوڑ میں لگادیتا ہے جہاں سکون نام کی کوئی چیز نہیں۔ ''تم کر سکتے ہو'' کا نعرہ دراصل انسان کو اپنی بندگی کی حدود سے نکال کر خدائی کے دعوے کی طرف لے جانے کی ایک نفسیاتی کوشش ہے۔

پس چہ باید کرد؟ گمنامی کی فضیلت اور پندار ذات کا علاج

اس تمام فکری انتشار اور ڈیجیٹل مادیت کے غلبے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ: پس چہ باید کرد (اب ہمیں کیا کرنا چاہیے)؟ اس کا واحد حل اپنے اسلاف کی اس روایت کی طرف پلٹنا ہے جہاں انہوں نے ''کتاب التواضع والخمول'' جیسی تصانیف کے ذریعے انسانی نفس کی تربیت کی۔ ''خمول'' کا مفہوم ہے: گمنامی اختیار کرنا۔ یعنی جان بوجھ کر نظروں سے اوجھل رہنا اور شہرت کی ہوس سے دامن بچانا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے کسی کو مقبولیت عطا فرمادے تو وہ اس کا انتظامی معاملہ ہے، مگر خود بندے کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جانا کہ

''لوگ مجھے جانیں اور پہچانیں'' وہ مہلک مرض ہے جس نے آج دین کے طالب علموں کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے علم کے حصول میں نیت کے بگاڑ پر سخت تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(من طلب العلم لیجاری به العلماء او لیماری به السفهاء او یصرف به وجوه الناس الیه ادخله الله النار) (سنن الترمذی: ۲۶۵۴)

''جس نے علم اس لیے حاصل کیا کہ اس کے ذریعے علماء سے برابری کرے، بے وقوفوں سے تکرار کرے، یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل کرے گا۔''

سوشل میڈیا کا موجودہ ڈھانچا اس حدیث میں بیان کردہ فتنوں کا مکمل عملی نمونہ بن چکا ہے۔ اب ہر شخص اس دوڑ میں مگن ہے کہ لوگ اسے سنیں، اسے دیکھیں اور اس کی ویڈیوز یا اقتباسات پر داد دیں۔ خمول اور انکساری اب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ فیس بک اور دیگر پلیٹ فارمز دراصل وہ ڈیجیٹل آئینے ہیں جہاں انسان ہر لمحہ اپنے سوشل امیج کا طواف کرتا ہے اور لوگوں کی توجہ سمیٹ کر نہال ہوتا ہے۔

خود پسندی کے اس فتنۂ پر زیب النساء مخفی (دختر اورنگ زیب عالمگیر) کا ایک واقعہ نہایت سبق آموز ہے۔ ان کے پاس چینی مٹی کا ایک نہایت نفیس اور قیمتی آئینہ تھا جو ایک روز ان کی باندی کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ باندی نے خوف اور حسرت کے عالم میں یہ مصرع پڑھا:

از قضا آئینۂ چینی شکست
قسمت سے چینی آئینہ ٹوٹ گیا

شہزادی زیب النساء نے جب یہ دیکھا تو نہایت تحمل اور درویشانہ شان سے جواب میں دوسرا مصرع لگایا:

خوب شد! سامان خود بینی شکست

''بہت اچھا ہوا کہ خود کو دیکھنے کا سبب ہی ختم ہو گیا۔''

یعنی آئینہ ٹوٹنا افسوس کی بات نہیں بلکہ مسرت کا مقام ہے کہ اب میں بار بار اپنی صورت دیکھ کی خود بینی (اپنی ذات میں مگن ہونا) کے فتنے سے محفوظ رہ سکوں گی۔

سائبر ورولڈ دراصل اسباب خود بینی کا ایک جدید اور پیچیدہ مظہر ہے۔ یہاں انسان نادانستہ طور پر اپنے ہی بنائے ہوئے ڈیجیٹل بت کی پوجا میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہ بڑی تگ ودو سے اپنے عکس کو سجاتا ہے، اسے سنوارتا ہے اور دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، پھر اسی مصنوعی عکس کے گرد طواف کرتے ہوئے اپنی پوری توانائی صرف کر دیتا ہے۔ یہ تصویری دنیا انسان کو ایک ایسے نفسیاتی خول میں بند کر دیتی ہے جہاں اسے اپنی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ صرف اپنی ستائش سننا چاہتا ہے اور اس کی تڑپ ہوتی ہے کہ کائنات کی تمام نگاہیں اسی کے وجود پر مرکوز رہیں۔

اس مہلک کیفیت کا سب سے مؤثر اور فطری علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے ذوق اور طبع میں گمنامی کو جگہ دے۔ شہرت کی ہوس میں دامن بچانا اور گوشہ نشینی کو ایک الٰہی نعمت تصور کرنا ہی وہ ڈھال ہے جو انسان کو خود پرستی سے بچاتی ہے۔

اگر باری تعالیٰ اپنی حکمت سے کسی کو کسی بڑے مقصد کے لیے منتخب فرمالے، یا مستند اکابر کوئی بھاری ذمہ داری تفویض کر دیں، تو وہ ایک انتظامی ضرورت ہے، لیکن خود سے آگے بڑھنا، اپنی ذات کو پیش کرنا اور خود کو مرکز نگاہ بنانا نفس کے لیے ایسا زہر ہے جو انسان کی روحانیت کو آہستہ آہستہ فنا کر دیتا ہے۔ سلامتی کا راستہ صرف یہی ہے کہ انسان خود نمائی سے گریز کرے۔ بندگی کا اصل مزاج یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی کو اپنے بڑوں (اکابر و مصلحین) کے تابع کر دے۔ وہ کچھ کرے تو ان کے ایماء پر، اور اگر وہ خاموش رہنے کا اشارہ کریں تو خاموشی ہی کو اپنی معراج سمجھے۔ یہی وہ تفویض اور تسلیم ہے جو ایک عام انسان کو بندۂ حق کے مرتبے پر فائز کرتی ہے۔

جو شخص خود کو ایک خود مختار وجود (autonomous being) تصور کر کے زندگی کا ہر فیصلہ محض اپنی عقل اور مرضی کی بنیاد پر کرتا ہے، وہ بالآخر شدید ذہنی دباؤ

(depression) اور پچھتاوے کا شکار ہو جاتا ہے۔ عصر حاضر میں نوجوانوں کے لیے زندگی کا اہم ترین موڑ ازدواجی زندگی کا انتخاب ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ پسند کی شادی کی ناکامی انسان کو اس لیے زیادہ توڑ دیتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس فیصلے کا تمام تر بوجھ اس کی اپنی ذات پر تھا۔ اس کے برعکس، بڑوں کے مشورے اور مرضی سے طے پانے والے رشتے میں اگر کوئی تلخی آ بھی جائے، تو انسان کو یہ نفسیاتی سہارا میسر ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ بڑوں کا تھا۔ یہی احساس اسے اندرونی طور پر ٹوٹنے سے بچاتا اور مضبوط رکھتا ہے۔ مشہور مفکرہ Hannah Arendt نے اسی انسانی نفسیات کی کیا خوب ترجمانی کی ہے:

''ہم آزادی کی اذیت برداشت نہیں کر سکتے۔''

جب فیصلے کی مکمل ذمہ داری فرد کے کندھوں پر ہوتی ہے، تو وہ اس بوجھ تلے دب کر بکھرنے لگتا ہے۔ سلامتی اور سکون صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان خود کو بڑوں کی فکری و سماجی حفاظت میں دے دے۔ دین اسلام جس شخصیت کی آبیاری کرتا ہے، اس کا حسن ہی یہ ہے کہ آدمی گمنام رہنے کو شہرت پر ترجیح دے اور اپنے نفس کی بڑائی سے بچے۔ اسلاف نے ''کتاب التواضع والخمول'' جیسی تصانیف اسی لیے رقم کیں تاکہ انسان کو سکھایا جا سکے کہ 'خمول' (گمنامی) نفسانی آلودگیوں سے بچنے کی بہترین ڈھال ہے۔ جو شہرت کے پیچھے دوڑتا ہے، وہ نادانستہ طور پر اپنے ہی نفس کی پرستش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج سوشل میڈیا نبوی انتباہ کا زندہ مظہر بن چکا ہے۔ جب انسان علم یا عمل کو محض لوگوں کی توجہ سمیٹنے **(یصرف به وجوه الناس الیه)** کا ذریعہ بنالے، تو وہ حب جاہ اور حب مال کے اس شکنجے میں کسا جاتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے دین کی بربادی کے لیے ''دو بھوکے بھیڑیوں'' سے تشبیہ دی ہے۔ ان تمام فکری و نفسیاتی فتنوں سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم اپنے وجود کو کلمۂ توحید کی مرکزیت میں لائیں اور اپنی مستند علمی روایت سے جڑے رہیں۔ جب تک ہماری جڑیں اپنی اصل سے پیوست ہیں، ہم جدیدیت کے ان طوفانوں میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر مفتی فہد انوار

دل

قرآن اور جدید طبّی تحقیقات کی روشنی میں

قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں دل کی مختلف حالتوں کو ذکر کیا گیا ہے۔ان حالتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دل کی مختلف اقسام ہیں۔ایک ہی آدمی کا دل بھی ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ اس میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ دل مسرت اور عنائی سے پُر بھی ہوتا ہے اور رنج و غم کا صدمہ بھی اٹھاتا ہے، یہ ایمان و محبت الٰہی کے کمالات سے متصف بھی ہوتا ہے اور کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں بھی ڈوبتا ہے، یہ جب یقین کی دولت اور ایمان کی حرارت سے سرشار ہوتا ہے تو جہاد زندگانی میں نت نئے کارنامے وجود پاتے ہیں اور جب اس میں عشق آتش سرد پڑ جاتی ہے تو زندگی کی رونق ماند پڑ جاتی ہے۔ دل مذہب کا بھی موضوع ہے اور سائنس کا بھی، صوفیاء بھی دل کی درستگی اور اصلاح پر زور دیتے ہیں اور شعراء بھی دل کے حالات کی لفظوں میں عکاسی کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت سلطان باہو دل کی گہرائی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

دل دریا سمندروں ڈونگے　　کون دلاں دیاں جانے ہو

جبکہ دل کی وسعتوں کو خواجہ میر درد نے یوں بیان کیا۔

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے　　میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

دل جسم انسانی کا ایسا عضو ہے جس کا کام انتہائی اہم ہونے کے ساتھ انتہائی پیچیدہ ہے۔ تمام بدن کو صاف خون فراہم کرنا اور تمام بدن سے خون لینا دل کا کام ہے۔ اس خون کے ذریعے خوراک جسم کے مختلف حصوں تک پہنچ جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تازہ ہوا بھی فراہم ہوتی ہے۔ خون کو وصول کرنا اور پھر خون کو آگے دھکیلنے کے دوران دل بند بھی ہوتا ہے اور کھلتا بھی ہے۔ اس سارے عمل کو کارڈیک سائیکل کا نام دیا جاتا ہے جس کا دورانیہ ۸ سیکنڈ کا ہوتا ہے۔ دل کی حرکت جاری رکھنے کیلیے دل کے اندر ہی ایک ایسا نظام رکھ دیا گیا ہے جو کسی بیرونی اشارات کا پابند نہیں بلکہ دل کے اندر برقی لہریں خود بخود پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دل کے اس خودکار برقی نظام میں اگر کہیں خرابی پیدا ہو جائے تو خون کی گردش کا یہ سارا سلسلہ متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمام بدن انسانی آکسیجن اور دیگر ضروری اجزا کی بر وقت اور

مناسب فراہمی سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا دل کا صحت مند ہونا تمام بدن کی صحت کے لیے ضروری ہے اور دل کی خرابی تمام بدن کی خرابی کا ذریعہ ہے۔

ارشادات نبوی کی روشنی میں دل احساسات وجذبات کا مرکز ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف زمانۂ قدیم سے شعراء و مفکرین بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔ تاہم سائنس کا اس نکتے پر اتفاق نہیں تھا جس کی وجہ سائنسی مشاہدات کی کوتاہ نظری رہی ہے۔ سائنس کے نزدیک جذبات واحساسات سے متعلق ہیں مثلاً سرد و گرم، لذت والم، یادداشت، لمس وغیرہ کے دماغ کے اندر مراکز ہیں اور نسوں کے ذریعے ان تک پیغامات کی منتقلی اور پھر آگے ان پیغامات کی ترسیل ہوتی ہے۔ یہ سائنسی حقائق اپنی جگہ لیکن ان سے دل کا احساسات وجذبات کا حامل ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ مزید یہ کہ اب سائنس بھی اس کا اقرار کرتی ہے کہ دل کے اندر احساس کا مرکز ہے۔ طب کی ایک مستقل شاخ نیوروکارڈیالوجی کے نام سے وجود پا چکی ہے جس میں دل اور دماغ کے تعلقات سے بحث ہوتی ہے۔ کینیڈین سائنسدان ڈاکٹر جے۔ اینڈریو آرمر نے ۱۹۹۱ء میں ایک تحقیقی مقالے میں دل کے اندر ایک چھوٹے سے دماغ کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق دل میں ۴۰ ہزار نیورونز ہوتے ہیں۔ یہ نیورون نسوں (نروز) کا سب سے چھوٹا جزو ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ جسم میں احساسات کا نظام نسوں کے ذریعے ہی انجام پاتا ہے۔ دل میں پائے جانے والے یہ نیورونز، دل سے پیغام لے کر دماغ تک جاتے ہیں اور دماغ سے پیغام لے کر دل تک لاتے ہیں۔ البتہ دل سے دماغ تک جانے والے پیغامات زیادہ ہوتے ہیں۔ گویا دماغ، دل کے تابع ہے۔ اس تحقیق کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید تحقیقات بھی کی گئی ہیں مثلاً ایک تحقیق یہ کی گئی ہے کہ دل الم کو محسوس کرتا ہے۔ ان تحقیقات کے نتیجے میں سائنس بھی اب یہ تسلیم کرتی نظر آرہی ہے کہ احساسات وجذبات کا مرکز دل ہے۔

سائنسی مشاہدات کی اس تائید کے بعد یہ بات ذہن میں رکھنی بھی ضروری ہے کہ مذہب کا اصل موضوع جسم انسانی کی بجائے روح انسانی ہے، اگرچہ روح کا سوار اسی جسم پر سواری کرتا ہے لہٰذا جسم کے متعلق ضروری ہدایات بھی کی گئی ہیں۔ جسم انسانی کو فنا ہے لیکن روح امر رب ہونے کی وجہ سے جدا ہونے کے باوجود باقی رہتی ہے۔ قرآن کریم، احادیث مبارکہ اور ارشادات صوفیا میں جس دل کا ذکر ہے وہ ایک نظر نہ آنے والی شے ہے۔ صحیح عقائد، نیک اعمال اور کثرت ذکر اللہ سے یہ نظر نہ آنے والا لطیفہ روشن و منور ہو جاتا ہے جبکہ بدعقیدگی اور گناہوں کی تاریکی سے اس پر ایک ظلمت اور تاریکی چھا جاتی ہے۔ اس لطیفۂ دل کو

اس نظر آنے والے مضغۂ دل سے ایسی نسبت ہے جیسے مکین کو مکان سے یا مظروف (برتن کے اندر کی چیز) کو ظرف (برتن) سے ہے۔ گویا یہ دل کا لوتھڑا اس دل۔ جس کی مختلف حالتوں کا بیان کیا جاتا ہے۔ کے لیے کمرہ ہے۔

ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

اب قرآن حکیم سے دل کی مختلف حالتوں اور ان کے اعتبار سے دل کی اقسام کو بیان کیا جاتا ہے:

کلام الٰہی میں دل کی مختلف حالتیں

(۱) قلب مریض: بیمار دل (نفاق کی بیماری سے متاثر دل)

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔ (سورۃ البقرہ: آیت ۱۰)

''ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھا دی اللہ نے ان کی بیماری اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے۔''

وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۔ (سورۃ المدثر: آیت ۱۳)

''اور تاکہ جن کے دلوں میں نفاق کی) بیماری ہے اور کافر یہ کہیں کہ اللہ کی اس بیان سے کیا غرض ہے۔''

(۲) سخت دل (یہ ایسے دل ہیں جو عبرت حاصل نہیں کرتے)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔ (سورۃ البقرہ: آیت ۷۴)

مگر ایسی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی آخر کار تمہارے دل سخت ہو گئے پتھروں کی طرح سخت۔ بلکہ سختی میں کچھ ان سے بڑھے ہوئے۔ کیونکہ پتھروں میں کوئی تو ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں، اور ان میں کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے۔ اور ان میں کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر

نہیں ہے۔ **لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ۔** (سورۃ الحج آیت: ۵۳)

تاکہ شیطان کی آمیزش کو ان لوگوں کے لیے آزمائش بنا دے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل سخت ہیں، اور بے شک ظالم بڑی ضد میں پڑے ہوئے ہیں۔ **اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰي نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔** (سورۃ الزمر آیت: ۲۲)

بھلا جس شخص کا سینہ خدا نے اسلام کے لئے کھول دیا ہو اور وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی پر ہو (تو کیا وہ سخت دل کافر کی طرح ہو سکتا ہے) پس ان پر افسوس ہے جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔ اور یہی لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

ف: چونکہ سینہ دل کا مقام ہے، تو ایمان کی تصدیق کے بعد اس میں وسعت پیدا ہو کر احکام کی قبولیت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے اس شرح صدر کی نشانی یہ بیان فرمائی کہ:

۱۔ ہمیشہ کے گھر کی طرف دل کا لگ جانا۔ (یعنی آخرت کی فکر اور جنت کا شوق)۔
۲۔ دھوکے کے گھر سے دل کا اٹھ جانا۔ (یعنی دنیا سے بے رغبتی)۔
۳۔ موت سے پہلے موت کی تیاری میں لگ جانا۔

(۳) گنہگار دل

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔ (سورۃ البقرہ: ۲۸۳)

اور شہادت کو ہرگز نہ چھپاؤ، جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل گناہ آلود ہے۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔''

(۴) ٹیڑھے دل (فتنہ و فساد پھیلانے کے خواہش مند دل)

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ۔ (سورۃ آل عمران آیت: ۷)

جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں متشابہات ہی کے پیچھے رہتے ہیں، اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

دل کے ٹیڑھے پن سے بچنے کے لیے خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دعا تلقین فرمائی ہے:

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ (سورۃ آل عمران آیت:۸)

''پروردگار! جب کہ تو ہمیں سیدھے راستے پر لگا چکا ہے تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو۔ ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔''

(۵) فہم سے عاری دل (نہ سمجھنے والے دل)

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (سورۃ الاعراف آیت:۱۷۹)

''اور حقیقت یہ ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھو گئے ہیں۔''

ف: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا گیا ہے کہ افضل ترین عبادت دین میں سمجھ بوجھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سمجھ بوجھ کو دل کی صفت بنایا ہے، چنانچہ فرمایا **(لَهُمْ قُلُوْبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا)** (موسوعتہ نضرۃ النعیم، ج۸ ص ۳۴۵۲، دار الوسیلہ، جدہ)

(۶) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ (سورۃ الانفال۔ آیت:۲)

''سچے اہل ایمان وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں، اور اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔''

ف: حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں یعنی وہ اس (کے عذاب) سے خوف کرتے ہوئے اس کے حکموں کو بجالاتے ہیں اور ان کی منع کردہ چیزوں سے رک جاتے ہیں۔

الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰي مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (سورۃ الحج۔ آیت :۳۵)

جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، جو مصیبت بھی اُن پر آتی ہے اُس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے ان کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۔ (سورۃ المؤمنون:۶)

''اور وہ جو عمل بھی کرتے ہیں اسے کرتے وقت ان کے دل اس بات سے سہمے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے پروردگار کے پاس واپس جانا ہے۔''

ف: یعنی نیک عمل کرتے ہوئے بھی ان کے دل میں بڑائی نہیں آتی بلکہ وہ سہمے رہتے ہیں کہ اس عمل میں ایسی کوتاہی نہ رہ گئی ہو جو اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب بن جائے۔ (آسان ترجمہ قرآن)

(۷) مہر لگے ہوئے دل (یعنی جن میں ہدایت داخل نہ ہو سکے)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَاۗءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (سورۃ یونس۔ آیت:۷۴)

''پھر نوح علیہ السلام کے بعد ہم نے مختلف پیغمبروں کو اُن کی قوموں کی طرف بھیجا اور وہ اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر جس چیز کو انہوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا اسے پھر مان کر نہ دیا اس طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔''

(۸) ذکر اللہ سے اطمینان پانے والے دل

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ۔ (سورۃ الرعد۔ آیت:۲۸)

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان پاتے ہیں، سنو اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے، جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

(۹) مجرموں کے دل

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۔ (سورۃ الحجر:۱۲، ۱۳)

''مجرم لوگوں کے دلوں میں ہم یہ بات اسی طرح داخل کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور پچھلے لوگوں کا بھی یہی طریقہ چلا آیا ہے۔''

ف: ''یہ بات'' سے قرآن کریم بھی مراد ہو سکتا ہے یعنی قرآن کریم ان کے دلوں

میں داخل تو ہوتا ہے لیکن ان کے مجرمانہ طرز عمل کی وجہ سے انہیں ایمان کی دولت نہیں بخشتا۔ اور ''یہ بات'' سے ان کے مذاق اڑانے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے یعنی ان کے مجرمانہ طرز عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اور کفر بغاوت اور استہزاء ان کے دلوں میں داخل کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لاتے۔ (آسان ترجمہ قرآن)

(۱۰) غافل دل: اللہ کی یاد سے غافل دل

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (سورۃ الکہف۔ آیت:۲۸)

''اور ایسے شخص کی باتوں کی پیروی نہ کرو جس کا دل ہماری یاد سے غافل ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشات پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال حد سے گزر گیا ہے۔''

(۱۱) قلب متقی

یہ وہ دل ہے جو اللہ کے خوف اور عظمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی تعظیم کرے۔

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَي الْقُلُوْبِ۔ (سورۃ الحج۔ آیت: ۳۲)

''یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو)، اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔''

(۱۲) اندھے دل (جو عبرت حاصل نہ کریں)

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔ (سورۃ الحج۔ آیت:۴۶)

''کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے، حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔''

(۱۳) قلب مخبت: حق بات کے آگے جھک جانے والے دل

وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (سورۃ الحج۔ آیت:۵۴)

'' اور علم سے بہرہ مند لوگ جان لیں کہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے اور وہ اس پر ایمان لے آئیں اور ان کے دل اس کے آگے جھک جائیں، یقیناً اللہ ایمان لانے والوں کو ہمیشہ سیدھا راستہ دیکھا دیتا ہے۔''

(۱۴) قلب سلیم: وہ دل ہے جو شرک اور شکوک و شبہات سے پاک ہو

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۔ (سورۃ الشعرا۔ آیت:۸۸، ۸۹)

جس دن نہ کوئی مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔ مگر جو اللہ کے پاس سلامتی والا دل لے کر آیا۔''

(۱۵) منقبض دل

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (سورۃ الزمر۔ آیت:۴۵)

''جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل (منقبض ہو جاتے ہیں) کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔''

(۱۶) متکبر دل: اللہ ہر متکبر اور جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔ (سورۃ المومن۔ آیت:۳۵)

'' اور جو لوگ اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی سند یا دلیل آئی ہو، یہ رویہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے اسی طرح اللہ ہر متکبر اور جبار کے دل پر ٹھپہ لگا دیتا ہے۔''

(۱۷) قلب منیب: اللہ سے توبہ کرنے اور اس کی اطاعت میں لگا رہنے والا دل

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَاۗءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ۨ ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۔ (سورۃ ق: آیت:۳۳، ۳۴)

''جو رحمان سے بغیر دیکھے ڈر گیا اور رجوع کرنے والا دل لے کر آیا۔ تم سب اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، وہ دن ابدی زندگی کا دن ہو گا۔''

(۱۸) ذکر اللہ سے پگھلنے والے دل

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔

(سورۃ الحدید۔ آیت:۱۶)

''کیا ایمان لانے والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے سامنے جھکیں۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں، جنہیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر سابق بنے ہوئے ہیں۔''

(۱۹) قلب مھدی: ہدایت یافتہ دل

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ (سورۃ التغابن۔ آیت:۱۱)

'' اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے، اور اللہ ہر چیز جاننے والا ہے۔''

یعنی مصیبت کے وقت مومن کے دل کو اللہ تعالیٰ اطمینان عطا فرماتے ہیں۔ اس کا دل اگرچہ غمگین کیوں نہ ہو لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہتا ہے اور اس کے سامنے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مصلحتوں سے اس سے زیادہ واقف ہیں۔ مندرجہ ذیل حدیث مبارکہ سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے:

''عجباً للمؤمن، لایقضی اللّٰہ لہ قضاء الا کان خیر لہ، ان اصابتہ ضراء صبر فکان خیر لہ، وان اصابتہ سراء شکر فکان خیرا لہ، ولیس ذالک لاحد الا للمؤمن۔''

ترجمہ: ''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے اللہ تعالیٰ اس کے حق میں جو فیصلہ بھی فرماتے ہیں وہ اس کے لیے خیر ہی ہوتا ہے۔ اگر اسے مصیبت پہنچے تو اس پر صبر کرتا ہے تو یہ اس کے حق میں خیر ہوتی ہے۔ اور اگر اسے بھلائی پہنچے تو شکر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے حق میں خیر ہوتی ہے۔ اور یہ بات صرف مومن کے لیے ہی ہوتی ہے۔''

مالک ہے جو چاہے کرے تصرف — کیا وجہ کسی بھی فکر کی ہے
بیٹھا ہوں میں مطمئن کہ یارب — حاکم بھی ہے تو حکیم بھی ہے

(۲۰) زنگ آلود دل: اعمال بد کی وجہ سے دلوں پر زنگ چڑھ جاتا ہے

كَلَّا ۜ بَلْ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۔ (سورۃ مطففین: آیت ۱۴)

بلکہ دراصل ان کے دلوں پر ان کے بُرے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

محمد موسیٰ بھٹو

اقتدار اور منصب کے فوائد و نقصانات

اقتدار اور منصب کے فوائد بھی ہیں تو اس کے نقصانات بھی۔ فوائد یہ ہیں کہ اس سے قوم وملک کی تعمیر کا کام بہتر طور پر ہو سکتا ہے غریبوں کی پرسان حالی کا بہتر نظام متشکل ہو سکتا ہے، انصاف کا ایسا نظام قائم ہو سکتا ہے کہ فرد کو گھر بیٹھے اور پیسہ خرچ کئے بغیر انصاف مل سکتا ہے، اقتدار سے قانون کا راج قائم ہو سکتا ہے جس سے مکمل امن وامان ہو سکتا ہے، اقتدار سے ریاست کا تعلیمی نظام بھی تیار ہو سکتا ہے، جس سے افراد کی دلوں کی حالت تبدیل ہو اور ایک دوسرے سے محبت کی فضا عام ہو اقتدار اور منصب سے اس طرح کے بہت سارے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

اقتدار اور منصب کے نقصانات یہ ہیں کہ صاحبان اقتدار قومی وسائل کو اپنی ذات کو مستحکم کرنے اور اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کے لئے استعمال کریں جس سے انصاف کے بجائے ظلم شروع ہو، اور قومی وسائل کی لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو۔

بد قسمتی سے منصب اور اقتدار اکثر اسی مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس اعتبار سے منصب اور اقتدار بہت بڑی آزمائش ہے ایسی آزمائش کہ فرد کی ابدی زندگی ہولناک سزا سے دوچار ہو سکتی ہے۔

امام غزالی نے احیاء العلوم میں ایک حدیث شریف نقل کی ہے کہ سرکاری عمال آخرت میں تمنا کریں گے کہ اے کاش انہیں دنیا میں آسمان پر لٹکایا جاتا اور عہدے نہ دیئے جاتے اس لئے کہ وہ عہدوں کی وجہ سے ظلم وستم کی راہ پر گامزن رہے۔

ایک حدیث شریف اس طرح کی بھی ہے کہ اقتدار کی طلب نہ کی جائے، اس لئے کہ طلب کرنے سے صاحب اقتدار کے ساتھ اللہ کی مدد نہیں رہتی، اگر طلب کے بغیر (یعنی بے نیازی کی حالت میں اقتدار مل جائے) تو ایسے فرد کے ساتھ اللہ کی مدد شامل ہو جاتی ہے اس طرح وہ اقتدار کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کرنے سے بچ جاتا ہے۔

منصب اور اقتدار کی وجہ سے عام طور پر فرد سے جو زیادتیاں ہوتی ہیں اور جس طرح اس کی ذات سے ہزاروں لاکھوں افراد اذیت و تکلیف کا شکار ہوتے ہیں، یہ چیز بجائے خود بہت بڑی سزا ہے جو صاحب اقتدار و صاحب منصب کو ملتی ہے۔

انسان میں بنیادی طور پر اقتدار کی طلب پائی جاتی ہے، اس لئے کہ اس سے اس کی ذات کو دوسروں پر برتری حاصل ہوتی ہے اس لئے نفس کے احساس برتری کے جذبہ کو پامال کرنے کی سخت ضرورت ہے، ورنہ صاحب اقتدار فرد ابدی زندگی میں ہمیشہ روتا رہے گا۔

محمد موسیٰ بھٹو

انسانی شخصیت کا اسفل حصہ

اور اس کا کردار

انسانی شخصیت کے دو حصے ہیں ایک حصہ نفس اور مادی عقل پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ دل اور روح سے عبارت ہے، نفس اور عقل کی جب پاکیزہ بنیادوں پر تربیت اور تزکیہ کا اہتمام نہیں ہوتا تو یہ نفس اسفل اور پست حالت میں آجاتا ہے اور اس پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی اور شخصیت پر نفس کی قوتوں کی حکمرانی ہونے لگتی ہے، پاکیزہ تہذیب، وعظ و نصیحت اور عقلیت کا استعمال وغیرہ سب بے اثر اور غیر اہم ہو جاتا ہے اس لئے کہ نفس کی خواہشات میں طوفان کی سی تیزی ہوتی ہے، یہ خواہشات فرد و افراد کو بہا کر لے جاتی ہیں۔ خواہشات کی حکمرانی کی صورت میں آپ کو نفس کو پاکیزہ تہذیب کا کتنا ہی واسطہ دیں، اور اسے کتنا ہی سمجھائیں کہ وہ فساد کی روش چھوڑ دے اور سلیقہ انسانیت اور عبدیت کا راستہ اختیار کریں اور خدا خوفی کا مظاہرہ کریں، وہ عام طور پر ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

انسانی شخصیت کی یہ اسفل حالت ایسی ہے جو ہمیشہ دنیا میں فساد برپا کرنے کا موجب رہی ہے، یہ خدا کے مقابل کی حیثیت سے سامنے آتی ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر شیطان کی ہمنوائی کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

انسانی شخصیت کا دوسرا حصہ جو دل اور روح پر مشتمل ہے، وہ محبوب حقیقی کے لئے تڑپتا رہتا ہے، وہ اللہ سے محبت کے رشتے میں منسلک ہونا چاہتا ہے، شخصیت کے اسفل حصے کی خرابیوں سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وجدانی اور روحانی قوتوں سے کام لے کر نفس کی اسفل قوت پر قابو پایا جائے، ایسا کرنے کے لئے وحی کی روشنی میں تزکیہ کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، جہاں رفتہ رفتہ نفس کی اسفل قوت مہذب ہونا شروع ہو جاتی ہے اور خواہشات کا زور

ٹوٹنے لگتا ہے، اور نفس کی فساد برپا کرنے کی حالت بدلنے لگتی ہے اور اس پر وجدانی اور روحانی قوتیں غالب آکر نفس کو نفس مطمئنہ میں تبدیل کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

نفس کے پست اثرات سے بچنے اور اسے مہذب بنانے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے، ہر انسان کا نفس عام طور پر پست حالت میں رہتا ہے، کوئی قانون کوئی تہذیب اور عقلی اصلاح کی کوئی تحریک نفس کی اس پست حالت کو بہتر بنانے کا باعث نہیں بن سکتی، البتہ تعلیم و تربیت کے نظام سے اس کی حالت تھوڑی بہت تبدیل ہو سکتی ہے لیکن نفس خواہشات کی حکمرانی سے پھر بھی دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اس کے لئے دل اور روح کی صلاحیتوں کو بیدار کرنا پڑتا ہے اور وحی کی روشنی میں نفس کو پاکیزگی کے مراحل سے گزارنا پڑتا ہے۔

موجودہ دور میں نفس کی قوتوں کا برپا کردہ فساد ہمہ گیر جہتی صورت اختیار کر گیا ہے، انسانیت شخصیت کے اس اسفل حصہ کی وجہ سے عاجز ہو چکی ہے، خود شناسی اور خدا شناسی کے ذریعے ہی نفس کی اس اسفل حالت جھٹکارہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

محمد موسیٰ بھٹو

انسانیت کا سب سے بڑا المیہ
نفسا نفسی کی بڑھتی ہوئی حالت

اس وقت انسانیت سب سے زیادہ جس روگ میں مبتلا ہے وہ نفسا نفسی کا روگ ہے، نفسا نفسی کا مطلب ہر فرد اپنی ذات اور اپنے مفادات کا اسیر بن جاتا ہے، اسے دوسروں کی کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ اس کے ماں باپ، عزیز و اقارب کس حالت میں ہیں، ان کو دو وقت کی روٹی میسر ہے یا نہیں، وہ جسمانی صحت کے اعتبار سے بہتر ہیں یا مریض ہیں، نفسا نفسی کی فضا میں یہ ساری چیزیں غیر ضروری ہو جاتی ہیں۔

نفسا نفسی کی خاصیت بد انسان جیسی اشرف المخلوقات کو جانور سے بھی زیادہ بدتر بنا دیتی ہے کہ جانور کو عام طور پر اپنے علاوہ کسی کی نفسا نفسی کی حالت کو بدل کر فرد کو صحیح معنٰی میں انسان بنانے اور دوسروں کے لئے شفیق اور رحم دل بنانے میں خدا کا عقیدہ اور دین و مذہب ہی اہم کردار ادا کرتا ہے، اس لئے کہ دین و مذہب نفس کی قوت پر ضرب کاری لگا کر فرد کو فطرت کے پاکیزہ جذبات سے ہمہ آہنگ بنانے کا کردار ادا کرتا ہے، دین و مذہب سے انسانیت کے پاکیزہ جذبات و احساسات ابھرتے ہیں۔

انسانیت کا جب تک دین و مذہب سے گہرا تعلق رہا، تب تک انسانیت کا احترام، ان کی پرساں حالی اور ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنے ان کی مشکلات کے وقت ان کی مدد کرنے کا احساس غالب رہا، جب سے قوموں کے اجتماعی نظام سے دین و مذہب کی اہمیت کو غیر ضروری قرار دیا گیا ہے، اس وقت سے انسانیت سنگ دلی اور قساوت قلبی کا شکار ہو گئی ہے کہ دوسروں کے درد اور غم کو غم ہی نہیں سمجھا جاتا، ایک، فرد ارب پتی بن جاتا ہے جب کہ اس کے عزیز و اقارب نان شبینہ کے محتاج رہتے ہیں، یہ انسانیت کا سب سے بڑا المیہ ہے جو اس دور میں واقع ہوا ہے۔

تنقیدی نفسیات

اور اس کی خرابیاں

تنقید ایسی چیز ہے، جو اگر اخلاص و درد مندی سے ہو تو اس سے شر کے بجائے خیر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس طرح کی تنقید آج کل مفقود ہو گئی ہے، آج کل جو تنقید مروج ہے، وہ تنقیدی نفسیات ہے، جس کے تحت دوسروں کو گرا کر اپنے آپ کو اور اپنے موقف کو برتر ثابت کرنا ہے، یہ تنقیدی مزاج اور نفسیات ایسی ہے، جس سے معاشرے میں ٹوٹ پھوٹ پیدا ہوتی ہے اور ایک دوسرے سے دوری بھی۔

صحیح تنقیدی صلاحیت (جس سے غلط اور صحیح کے درمیان فرق پیدا ہو) اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب فرد نفس کو اصلاح کے مراحل سے گزار کر، اپنی برتری کے جذبات سے بڑی حد تک محفوظ ہو چکا ہو، اس طرح کے افراد کی تنقید میں دوسروں کی دل آزاری نہیں ہوتی اور تشدد کا پہلو بھی نہیں ہوتا، اس طرح کی تنقید سے خیر پیدا ہوتا ہے، لیکن موجودہ دور میں اصلاح کی طلب نہ ہونے کی وجہ سے ذہین افراد میں تنقیدی حس غالب ہو گئی ہے۔

تنقید اگر مسلسل ہو اور مزاج کا حصہ بن چکی ہو اور اپنی بات کو مثبت طور پر پیش کرنے کی صلاحیت مفقود ہو تو اس طرح کی تنقید سے ایک تو افراد میں بوریت پیدا ہوتی ہے اور اس سے بدمزاجی پیدا ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ اس طرح کی تنقید فرد کے لئے نفسیاتی مرض کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

معاشرے کو توڑنے کی بجائے جوڑنے کی ضرورت ہے اور خیر سگالی پیدا کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر ہو، جب تک دوسروں کو اذیت نہ پہنچانے کی صلاحیت پیدا ہو تب تک تنقید سے بچا جائے، تنقید کوئی فرض تو ہے نہیں اور نہ ہی

ضروری ہے، جب کہ اپنی اصلاح کی فکر اور دوسروں کو اپنی زبان اور رویے سے اذیت سے بچانا یہ فرض ہے۔

تنقیدی نفسیات کی خرابیاں بہت زیادہ ہیں، ایسا فرد اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے دلوں میں (اپنی ذہانت کے باوجود) جگہ بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

تنقیدی نفسیات دراصل اپنی ذات سے غفلت اور دوسروں کی مصنوعی فکر مندی کا نتیجہ ہوتی ہے، اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ تنقید، احساس کی شدت کا موجب ہے، احساس کی شدت تو ویسے بھی فرد میں موجود ہوتی ہے، جس کا اظہار گھر والوں کے ساتھ روزمرہ زندگی میں عام طور ہوتا ہے، احساس کی یہ شدت جب علمی مزاج کے حامل فرد میں موجود ہو تو وہ علمی تنقید کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، علمی تنقید اگر مزاج کا حصہ اور وطیرہ نہ ہو تو وہ صحیح ہے لیکن علمی تنقید کے نام پر دوسروں کا تعاقب کرتے رہنا یہ انتہائی ناپسندیدہ بات ہے، فرد کو سب سے پہلے اپنی ذات کی فکر کرنی چاہئے، علم بھی یہی سکھاتا ہے کہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچایا جائے۔ باطل اور ظالم قوتوں کے خلاف تنقید یہ تو مستحسن بات ہے۔

ایک فاضل شخصیت نے خوب کہا ہے کہ جو شخص قلم پکڑتا ہے، وہ زبانِ حال سے اپنی فکر سے مخالف فکر رکھنے والوں سے کہتا ہے کہ سنبھل جاؤ، ورنہ تم میرے قلم کی زد سے بچ نہیں سکو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے احتساب سے پہلے اپنا احتساب ناگزیر ہے، جب اپنا احتساب ہونے لگتا ہے تو فرد یہ دیکھکر دنگ رہ جاتا ہے کہ اس کے باطن کی وسیع دنیا میں ایسی خرابیاں موجود ہیں، کہ اس کی شخصیت تو خود حالت خطرہ میں ہے۔

کچھ ہاتھ آتا نہیں بے آہ سحر گاہی

اقبال کہتے ہیں

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی
زمستانی ہوا، میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
لیکن مجھ سے نہ چھوٹے لندں میں بھی آداب سحر خیزی

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن علمی شخصیتوں سے بڑا کام لینا چاہتے ہیں اپنے دین کے اشاعت وفروغ کا، تو ایسی شخصیتوں کو رات کے آخری حصہ میں اٹھا کر ان کا اپنے ساتھ قریبی تعلق قائم کر لیتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کو ایسی ایمانی طاقت اور نور بصیرت عطا کرتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے فتنوں کو سمجھکر جرات سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کو اپنے دور کے علمی اسلوب میں بہتر طور پر پیش کرنے کی صلاحیت عطا کرتے ہیں جس سے اہل اسلام کو درپیش علمی اور ذہنی فتنوں کا زور ٹوٹنے لگتا ہے۔

کہتے ہیں آہ سحری یعنی تہجد کے بغیر علمی شخصیتوں میں محض علم واستدلال اور ذہنی قوتوں کی وجہ سے یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی، ان کے کلام اور تحریر میں وہ روح پیدا نہیں ہوتی کہ زمانہ کا رخ موڑا جاسکے۔

رات کے آخری حصہ میں اللہ کی عبادت سے شخصیت میں دوئی ودورنگی ختم ہو جاتی ہے اور بندے کے ساتھ اللہ کے طاقت مل جاتی ہے اور ذہن وفہم میں نورانیت آجاتی ہے اور دل کی صلاحیتوں میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگتا ہے ایسے افراد کو وہ قیمتی نکات سجھائی دیتے ہیں، جس سے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا جاسکتا ہے اور ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے ان کی باتوں میں غیر معمولی تاثیر رکھی جاتی ہے۔

اقبال آخر میں کہتے ہیں کہ میری اپنی حالت بھی یہ ہے کہ لندن میں سخت سردی کے موسم میں بھی مجھ سے تہجد کی سعادت نہیں چھوٹی، اس تہجد کی برکت سے کلام میں نئے نئے علوم سمائے ہوئے ہیں، جو قوم کی دلوں کو بے ساختہ کر دیتے ہیں۔

تہجد اگرچہ نفلی عبادت ہے جو اختیاری چیز ہے لیکن رات کے آخری حصہ میں نیند قربان کر کے اللہ سے تعلق مستحکم کرنے کے لئے کوشاں ہونا اللہ کو بندے کی یہ ادا بہت پسند ہے، اس لئے قرآن میں متعدد مقامات پر ایسے افراد کی تعریف کی گئی ہے، اس قربانی کی وجہ سے اللہ کی طرف سے بندے کو جو نعمت عطا کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے نفس کی قوت قابو میں آنے لگتی ہے اور فرد کی زبان سے نورانیت پر مشتمل گفتگو القا ہوتی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو یہ سعادت عطا فرمائے۔(آمین)

محمد موسیٰ بھٹو

بے لگام طرز زندگی
اور اس کے اثرات

جس طرح اونٹ کو باندھ دیا ہے، ورنہ وہ بھاگ جاتا ہے، اسی طرح نفس کی قوت کو بھی شریعت کی رسی سے باندھنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ وہ بے لگام ہو کر فرد اور معاشرے کے لئے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔

بے لگام طرز زندگی مسلمہ اخلاقی و روحانی اقدار سے آزادی پر مشتمل ہوتی ہے، جو خدا پرستی اور دین و مذہب کا بدل ہوتی ہے، سائنسی اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے دوسرے جو فائدے ہوئے ہیں، وہ اپنی جگہ، لیکن اس کے نقصان کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ بے لگام طرز زندگی کو فروغ ملا ہے، اتنا زیادہ فروغ کہ انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، بے لگام طرز زندگی سے خواہشات کی حکمرانی کی صورت پیدا ہوتی ہے، فرد و افراد اور پورا معاشرہ نفس کی قوتوں کا غلام بن جاتا ہے، جس سے روح اور روحانی قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں، روحانی قوتوں کے مفلوج ہو جانے سے افراد کا اعصابی اور دماغی نظام بھی بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔

بے لگام طرز زندگی دراصل مادہ پرست قوموں کی خاصیت اور ان کی شناخت ہے، جب کہ مسلمانوں کی زندگی خدا پرستی پر مشتمل اخلاقی اور روحانی اقدار سے وابستہ ہوتی ہے، لیکن بدقسمتی سے مادہ پرست قوموں کے اثرات نے مسلمانوں کی نسلوں کو بھی بے لاگ اور آزاد زندگی کی راہ پر ڈال دیا ہے، جو امت کا بڑا المیہ ہے۔

بے لگام زندگی کا سب سے بڑا نقصان جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان پیسہ کمانے کی مشین بن جاتا ہے اور انسانی تعلقات میں محبت کا عنصر رخصت ہو جاتا ہے، اور باہمی انسانی رویے مفاد پرستی پر استوار ہونے لگتے ہیں۔

مسلمانوں کا کام انسانوں کو خدا پرستی پر مبنی تہذیب سے آشنا کرنا ہے، نہ کہ ان کی مادی تہذیب سے متاثر ہونا۔

ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی پاکیزہ تہذیب سے ہمہ آہنگی پیدا کریں اور انسانیت کو بھی اس تہذیب سے آشنا کریں، اس لئے کہ انسانوں کی روح بے لاگ طرز زندگی سے تھک چکی ہے۔

انانیت کا نظریہ

اور اس سے بچاؤ کی ضرورت وصورت

اصلاح نفس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ انانیت کا نظریہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے ساتھ ساتھ میری ہستی بھی موجود ہے، جس کا دوسروں کو اعتراف کرنا چاہئے، اگر دوسرے اعتراف نہ بھی کریں تو بہر حال میری ہستی تو ہر صورت میں موجود ہے، بالخصوص جب بڑا منصب اور اقتدار ملتا ہے تو انانیت اور ''میں'' کا نظریہ پوری قوت سے سامنے آتا ہے اور میری امتیازی ہستی کو ماننے کی راہ میں جو بھی رکاوٹ بنتا ہے، اس کو قوت سے کچل دیا جاتا ہے۔

انانیت باقائدہ ایک نظریہ کی حیثیت سے سامنے آتی ہے، مغرب کے فلاسفر ایڈلر نے اپنی ساری زندگی کی تحقیق کا خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصود دوسروں پر بالادستی حاصل کرنا ہے اور انسان کی ساری تگ ودو اسی کے لئے ہوتی ہے۔

''میں'' اور انانیت کے نظریہ کی بنیادیں انتہائی گہری ہوتی ہیں، جس سے دستبرداری کا عمل انتہائی دشوار ہوتا ہے، شیطان نے اللہ کو جو چیلنج دیا کہ میں اولاد آدم کو ہلاک کروں گا، وہ انانیت کے اسی نظریہ کی بنیاد پر ہی دیا تھا، وہ اس پر پوری شدت اور قوت سے گامزن ہے، قرآن میں ہے **افرئیت من التخذ الھہ ھواہ** (کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو الہ (معبود) بنایا ہے۔)

جو شخص اصلاح نفس کی راہ پر گامزن ہوتا ہے اسے زندگی کے ہر موڑ پر اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ انانیت کا بت سامنے آکر اسے اپنی پرستش کے لئے اکساتا رہتا ہے، لیکن اللہ کی محبت اور کشش فرد کو کھینچ کر اس بت کی پرستش سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔

جذبہ انانیت اس قدر طاقتور ہونے کے باجود بدقسمتی سے اس نظریہ کی تباہ کاریوں کا ادراک حاصل نہیں ہے، یعنی فرد اپنے نفس کو الہ بھی مان رہا ہوتا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر انانیت کا مظاہرہ بھی کر رہا ہوتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے، میں تو سچے دل سے تو ایک ہی خدا کو مانتا ہوں، سچے دل سے ایک خدا کو ماننے کی بات اس وقت ہی صحیح ہو سکتی ہے جب فرد جذبہ انانیت سے دستبردار ہو کر اپنی شخصیت اور اپنی جداگانہ امتیازی حیثیت کو فنا کے گھاٹ اتار دے اور سراپا عاجزی کے مقام پر فائز ہو جائے، انسان کا اصل مقام اللہ کے سامنے کامل طور پر عبدیت کا مظاہرہ کرنا ہے، جو انانیت سے دستبردار ہوئے بغیر نہیں ہوتا۔

یقیناً کسی مسلمان کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اللہ کو معبود نہیں مانتا، لیکن انانیت کا گناہ ایسا ہے جو فرد کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے، باریک بینی سے خود احتسابی کے ذریعہ ہی انانیت کے بت سے نجات حاصل ہو سکتی ہے، اللہ کے وہ بندے جو اللہ کے ساتھ مخلص ہو چکے ہیں، جنہیں اہل اللہ کہا جاتا ہے، ان کے ساتھ محبت کا تعلق استوار کرنے سے فرد اس نظریہ سے دستبردار ہو کر عاجزی اور فنائیت کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

دماغ سے کام لینے کے اثرات

مغرب کے ایک ادارے (کمپنی) کے بارے میں پڑھ رہا تھا کہ ایک صاحب جو ایک کمرہ میں بند رہتے تھے اور غور و فکر کرتے رہتے تھے، وہ ادارے کے دوسرے بہت سارے لوگوں سے زیادہ قیمتی شمار ہوتے تھے اور اس کی تنخواہ سب سے زیادہ تھی حالانکہ دوسروں کا کام بظاہر بہت زیادہ تھا، سبب یہ تھا کہ یہ صاحب کمپنی کی ترقی کے لئے تدابیر سوچتے رہتے تھے اور ان کی تجویز کردہ تدابیر سے کمپنی کو بہت زیادہ ترقی ہوئی۔

یہ واقعہ اس بات کی علامت ہے کہ ذہن کو ایک خاص مرکزی نکتے پر چلاتے رہنے اور غور و فکر کرتے رہنے سے ذہن کو جدا ملتی ہے اور اس سے غیر معمولی کارنامے سرانجام ہوتے ہیں۔

معاشروں میں حقیقی دانشور اور مفکر کی اہمیت اس لئے زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی ساری ذہنی توانائیاں فکر دینے میں صرف کرتے ہیں، اور معاشرہ اس طرح کے مفکروں کی فکر پر چلتا رہتا ہے۔

اسی طرح اہل اللہ کی اہمیت اس لئے مسلمہ ہے کہ وہ اللہ کے مرکزی نکتے پر ذہن کا استعمال کرتے ہیں اور متوجہ الی اللہ ہونے کے لئے ذہنی توانائیاں صرف کرتے ہیں، جس سے ان کے ذہن و فکر اور دل میں نورانیت پیدا ہو جاتی ہے اور جو لوگ عقیدت سے ان کی صحبت میں آتے ہیں وہ ان کی شخصیت سے نورانیت اور روحانیت کے اجزا لے کر آتے ہیں، جس سے ان کی زندگی میں انقلاب برپا ہوتا ہے۔

دماغ کا ایک مرکزی نکتہ پر جمنا بڑا کٹھن کام ہوتا ہے، اس کے لئے رفتہ رفتہ دماغی صلاحیتوں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

جب دماغ ایک مرکزی نکتے پر آنے میں کامیاب ہوتا ہے تو اس سے جہاں دوسرے خیالات دب جاتے ہیں یا ثانوی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں، وہاں اس سے فرد معاشرے کے لئے زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

اہل اللہ کے ہاں دماغی ارتکازی قوت کے ذریعہ دل کو مستحکم کیا جاتا ہے کہ دل کا اللہ سے قرب کا مقام قائم ہو جائے اس میں اگر دماغ ساتھ نہ دے تو ایسا ہونا دشوار ہوتا ہے، اس لئے دماغ کی فیصلہ کن اہمیت ہے۔

البتہ دماغ کو اگر منفی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا تو اس سے معاشرے کی اخلاقی اور روحانی بنیادیں متزلزل بھی ہو سکتی ہے، جس طرح اس وقت عام طور پر ہو رہا ہے کہ موبائل کے آلہ کے ذریعہ ذہنوں کو مسموم کیا جا رہا ہے۔

اپنی اصلاح سے غافل فرد کا
معاشرے کے لئے باعث خطرہ ہونا

ہم میں سے ہر فرد جو اپنی اصلاح سے غافل ہے اور اس کے لئے فکر مندی و کاوش سے کام نہیں لیتا، وہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لئے بھی خطرہ ثابت ہو سکتا ہے، بلکہ ثابت ہوتا ہے، معاشرے کے لئے خطرہ ثابت ہونا بڑی المناک بات ہے، ایسا فرد اپنے معاشرتی، تجارتی یا دوستانہ تعلقات میں دوسروں کے لئے تکلیف اور اذیت کا موجب بن جاتا ہے، سبب یہ ہے کہ ذاتی اصلاح کے لئے کاوشوں کے بغیر شخصیت مفادات، اغراض، انا اور خود پرستی کے احساسات سے بھری رہتی ہے، ایسا فرد سلیقہ انسانیت سے بہرہ ور ہو سکے، مشکل تر ہے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ فرد کا سب سے پہلا اور بڑا کام یہ ہے کہ اس کی اپنی ذات دوسروں کو اذیت پہنچانے سے محفوظ رہے۔

جب فرد خود احتسابی سے کام لے کر اپنی اصلاح کا کام شروع کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اندر کی وسیع دنیا میں تو متعدد بت موجود ہیں، ان بتوں سے چھٹکارہ حاصل کر کے محض اللہ کے لئے زندگی گزارنا تو سب سے کٹھن کام ہے، نفس کو مجاہدوں کی بھٹی سے گزار کر اسے مہذب بنانا ہی سب سے پہلا اور اہم کام ہے، جو فرد اس مرحلے سے گزرتا ہے وہ معاشرے کا سب سے قیمتی فرد بن جاتا ہے، اس لئے کہ وہ اغراض، مفادات اور انانیت سے دستبردار ہو کر سونا بن چکا ہے، ایسا فرد زندگی کے جس شعبے سے بھی وابستہ ہوگا، وہ اپنے متعلقین کے لئے باعث خیر و برکت ثابت ہوگا۔

بدقسمتی سے موجودہ دور میں نگاہ کا مرکز فرد کی اپنی ذات نہ رہی ہے، بلکہ دوسروں ہیں۔

روح کی غذا

کہتے ہیں روح کی غذا موسیقی ہے جس سے فرد وجد میں آنے لگتا ہے اور اسے سکون ملنے لگتا ہے دراصل موسیقی روح کی نہیں بلکہ نفس کی غذا ہے، اس سے نفس لذت محسوس کرنے لگتا ہے اور اس سے نفس کے جنسی جذبات بھر گئے لگتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ موسیقی کے وقتی اثرات کے بعد نفس کی لذت ختم ہو کر فکری انتشار پیدا ہونے لگتا ہے اور شرم وحیاء کے جذبات مجروح ہونے لگتا ہیں، جو اس بات کی علامت ہیں کہ موسیقی روح کی غذا ہرگز نہیں۔

روح کی غذا تو اللہ کا کلام ہے، اچھی آواز سے قرآن کی تلاوت سے یا غور و فکر سے قرآن پڑھنے سے روح مسرت کے پاکیزہ احساسات سے سرشار ہونے لگتا ہے، اور پوری شخصیت پر طمانیت کی حالت طاری ہونے لگتی ہے، اس کا اثر فرد کے کردار اور رویے پر بھی پڑتا ہے کہ فرد نرم دل ہونے لگتا ہے اور محبت کے جذبات سے بہرہ ور بھی۔

اللہ کے کتاب کی یہ تاثیر ایسی ہے کہ بدقسمتی سے موسیقی کی گہما گہمی کی موجود فضا میں اس کا ادراک سلف ہو گیا ہے۔

اگر قرآن سے مستقل تعلق قائم رکھا جائے تو شخصیت پر اللہ کے انوار اس طرح نقش ہونے لگتے ہیں کہ روح کے ساتھ ساتھ نفس کی حالت بھی بدلنے لگتی ہے اور موسیقی سے نفس کا لگاؤ از خود ختم ہونے لگتا ہے۔

اللہ کی کتاب میں اتنی حلاوت و تاثیر ہے کہ فرد جوں جوں قرآن میں غوطہ زن ہوتا ہے، وہ دنیا ما فیھا سے بے نیاز ہونے لگتا ہے، اور اللہ کی محبت میں رچ بس جاتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ بیدار دل کے ساتھ قرآن کو پڑھا یا سنا جائے اور اس عمل کو مسلسل جاری رکھا جائے، اس

سے قرآن فرد کو نفس اور مادی قوتوں کے آزاد کر کے اللہ سے قریب سے قریب تر کر دیتا ہے اور موسیقی سے ہزار گناہ زیادہ حلاوت عطا فرماتا ہے۔

قرآن کا پڑھنا اور سننا تو ہر اعتبار سے افادیت کا حامل ہے، لیکن جب اسے دل کی گہرائیوں اور حضور قلب کے ساتھ پڑھا جاتا ہے تو اس سے زندگی کا رنگ بدلنے لگتا ہے اور موسیقی جیسی واہیات چیزوں سے تنفر پیدا ہونے لگتا ہے۔

محمد موسیٰ بھٹو

ہمارے کچھ اہم معاملات
احادیث نبوی کی روشنی میں

تمہارے بارے میں چھ چیزوں سے ڈرنا

فرمایا: میں تمہارے بارے میں چھ چیزوں سے ڈرتا ہوں، ایک بے وقوفوں کو امیر بنانا، دوم انسانی خون بہانا، سوم عدالتی فیصلے کا خرید و فروخت ہونا، چہارم قطعی رحمی کرنا، پنجم ایک نسل کا قرآن کو گانا بنانا، ششم سپاہیوں کا زیادہ ہونا۔ (کنزالاعمال)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو ہمارے موجودہ دور کے امت کے حالات کا مشاہدہ کرایا گیا تھا، اگرچہ ابھی یہ چھ چیزیں انتہائی عروج پر نہیں ہیں، تاہم یہ علامتیں بڑی حد تک پائی جاتی ہیں۔

وقت کا تیزی سے گزرنا

فرمایا: زمانہ قریب قریب ہوگا (یعنی وقت تیزی سے گزرتا جائے گا) علم قبض کر لیا جائے گا اور فتنے نمودار ہوں گے اور بخل پیدا ہو جائے گا، اور ہرج بڑھ جائے گا، دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ ہرج کیا ہے، فرمایا قتل۔ (بخاری ۶۰۳۷)

حدیث میں بیان کردہ دوسری علامتیں تو کسی حد تک موجود ہیں، لیکن زمانہ قریب قریب ہونی والی علامت تو ایسی ہے کہ دن اور سال تیزی سے بھاگ رہے ہیں، ابھی دن ہوتا ہی نہیں ہے کہ رات آنے لگتی ہے، ہفتہ اس طرح گزر جاتا ہے، جیسے ایک دن گزرا ہے، فرد حیران ہے کہ وقت کو کیا ہو گیا ہے، وقت میں یہ بے برکتی دراصل آخری دور کی نشانیوں میں سے ہے، اللہ ہمیں وقت کی قدر کر کے، اسے آخرت کی تیاری کا ذریعہ بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

فتنے کے زمانے میں عبادت کا ثواب

فرمایا: فتنے کے زمانے میں عبادت کا ثواب اتنا ہے جیسے میری طرف ہجرت کا۔ (مسلم شریف ۷۴۰۰)

فتنے کے زمانے میں چونکہ ذہن اور دل اپنے دور کے حالات، سیاسی تغیر و تبدل، معیشت و روزی کے حوالے سے بہت زیادہ پریشان، متفکر اور الجھا ہوا ہوتا ہے، اس لئے فتنے کے دور میں عبادت کی طرف میلان کم ہوتا ہے، خوش نصیب ہیں، وہ افراد جو فتنے کے دور میں عبادت کو وظیفہ بناتے ہیں۔

امت کے گمراہ قائدین سے ڈرنا

فرمایا: میں اپنی امت میں گمراہ قائدین سے ڈرتا ہوں، جب تلوار میری امت پر رکھی جائے گی تو قیامت کے روز تک نہ اٹھائی جائے گی۔ (ابوداؤد: ۴۲۵۲)

گمراہ قائدین، امت کے لئے عذاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، چونکہ انہیں اپنا اقتدار اور اپنے مفادات ہی عزیز ہوتے ہیں، اس لئے وہ اس مقصد کے لئے امت کے مفادات کو پامال کرنے کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب نئے نئے ملک اسلامی فتوحات میں شامل ہونے لگے اور آپ کی شہادت ہوئی تو چونکہ غیر تربیت یافتہ لوگ اسلامی مراکز میں آکر آباد ہونے لگے، اس لئے ان کے برپا کردہ فتنوں سے ریاست کا نظام معطل ہونے لگا، حضرت عثمان رضی اللہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے جو تلوار اٹھی ہے تو وہ اب تک اپنا کام کر رہی ہے، اللہ تعالیٰ امت کی حالت زار پر رحم فرمائے۔ (آمین)

فتنوں کی بھرمار کا ہونا

فرمایا: قیامت سے پہلے فتنے تاریک رات کی طرح ہوں گے کہ فرد صبح کو مومن ہوگا تو شام کو کافر ہوگا، اور پھر صبح کو کافر ہوگا، بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہوئے سے بہتر ہوگا اور چلتا ہوا

دوڑتے ہوئے سے بہتر ہوگا۔ پس اس وقت اپنی سختی کو ختم کرو، اپنی کمانوں کی تانتوں کو کاٹ ڈالو اور اپنی تلواروں کو پتھر پر دے مارو، پس تم میں سے جس نے بھی یہ کام کیا، وہ بنی آدم کا بہترین شخص ہوگا۔ (مشکوۃ ۵۲۹۶)

موجودہ دور میں جب کہ میڈیا اور تیز رفتار سواریوں کے ذریعہ پوری دنیا سکڑ کر ایک شہر کی صورت اختیار کر گئی ہے، اس لئے دنیا میں برپا ہونے والے سارے فتنوں کو ہر فرد کو میڈیا کے ذریعہ قریب سے دیکھنے اور اس کے مشاہدے کا موقعہ مل رہا ہے، نیز مادی تہذیب کا غلبہ عام ہو گیا ہے، طاغوت کی عالمی طاقت نے پوری انسانیت کو اپنا غلام بنانے کے لئے دنیا بھر کے باصلاحیت افراد بالخصوص امت کے ذہین افراد کی خرید و فروخت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، یہ ساری صورتحال ایسی ہے جس نے مسلم معاشروں کو فتنوں سے بھر دیا ہے اور ایک دوسرے سے تصادم کی فضا کو عام کر دیا ہے، اس طرح کی صورتحال میں صبر سے کام لے کر اپنے ایمان کو بچانا اور دوسروں کے معاملات میں الجھنے سے بچنا، سب سے بڑی نیکی شمار ہوگی، اس حدیث شریف میں اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

دین پر صبر کرنا

انگاروں کو ہاتھ میں لینے کے برابر ہونا

فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اپنے دین پر صبر کرنا ایسا ہوگا جیسے انگاروں کو ہاتھ میں لینا۔ (ترمذی شریف ۲۲۶۰)

یعنی دین پر قائم رہنا، دین پر عمل پیرا ہونا، استقامت سے دین پر چلنا سب سے مشکل ترین کام ہوگا۔

ایمان بچانے کے لئے گوشہ نشیں ہونا

فرمایا: عنقریب (ایسا دور آئے گا کہ) مسلمان کا سب سے بہترین مال بکریاں ہوں گی، جنہیں لے کر وہ پہاڑ کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات (سرسبز جگہوں) پر جائے گا تاکہ اپنے دین کو فتنوں سے محفوظ رکھے۔ (ابوداؤد ۴۲۶۷)

اس حدیث شریف سے مراد ایمان بچانا ہے، جو گوشہ نشینی سے حاصل ہو سکتا ہے، اگرچہ اسلام کے مزاج میں گوشہ نشینی نہیں ہے، لیکن جب حالات ایسے ہو جائیں کہ اس کے بغیر ایمان کا تحفظ مشکل ہو تو ایسے حالات میں گوشہ نشینی انتہائی ناگزیر ہو جاتی ہے، اس لئے کہ مادیت پرستی کے ہمہ گیر غلبے کی وجہ سے فرد اگر ایسا نہ کرے گا تو اس کی ایمان کی سلامتی کو شدید خطرات درپیش ہوں گے۔

یہ حدیث شریف ایسے حالات کے بارے میں ہے، جب لوگوں سے میل جول اور رابطے کے نتیجے میں ان کے طاقتور منفی اثرات کی زد میں آکر فرد کے اسلام واسلامیت کو خطرات درپیش ہوں، ویسے بھی اہل اللہ کے ہاں متوسط طالب کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ کم ملے اور کم گفتگو کرے، تاکہ اس کی شخصیت پر پوری طرح ذکر کے اثرات نقش ہو سکیں، اور ذکر کے زیر اثر وہ مادیت اور نفس پرستی کی قوتوں سے مزاحمانہ صلاحیت کا حامل ہو سکے، اور اپنے نفس کی شرارتوں اور اذیتوں سے دوسروں کو بچا سکے۔

مذکورہ حدیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ جب مادیت پرستی کی فضا غالب ہو جائے، لوگوں سے خلط ملط ہونے میں ایمان کے زیر وزبر ہونے کا خطرہ ہو تو اس طرح کی صورتحال میں ایمان کے تحفظ کے لئے گوشہ نشینی ناگزیر ہو جاتی ہے، البتہ اگر فرد فتنوں کے مقابلے کی ہمت رکھتا ہے تو پھر ایسا کرنا صحیح نہیں ہوگا، بلکہ فتنوں کے ماحول میں رہ کر فرد اپنی اصلاح بھی

کرتا رہے تو دوسروں کی اصلاح کے لئے بھی کوشاں ہو، اور فتنوں سے مقابلے میں بھی اپنی صلاحیتیں صرف کرے، لیکن اگر فتنے غالب ہوں تو پھر گوشہ نشینی ضروری ہو جاتی ہے۔

خاموشی و تفکر کے فوائد و ثمرات

فرمایا: انسان کو جو درجہ و مقام خاموش رہنے (تفکر کرنے) سے ملتا ہے، وہ ساٹھ سالہ نفلی عبادت سے بھی نہیں ملتا۔ (تخریج احادیث الاحیاء، کتاب الفکر: ۱۷۹۸/۱، بیروت)

خاموش رہنے اور تفکر کرنے سے دل کو محبوب حقیقی سے محبت کے رشتے کو مستحکم کرنے کا موقعہ ملتا ہے، خاموشی (اور تفکر) سے محبوب کے لئے دل کے ساز بجنے لگتے ہیں، خاموشی سے اندر میں غوطہ زن ہو کر، اللہ کے انوار حسن سے بہرہ وہ ہونے کی صورت پیدا ہوتی ہے، خاموشی اور تفکر سے اندر کی وسیع دنیا کا مشاہدہ ہوتا ہے اور نفس کی مکر وفریب کی ساری واردات کو سمجھنے اور ان پر قابو پانے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، خاموشی اور تفکر سے دل اور ذہن، اللہ کے لئے یکسو ہونے لگتے ہیں، اس تفکر میں جوں جوں اضافہ ہونے لگتا ہے، اسی حساب سے اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کی استعداد پیدا ہونے لگتی ہے، خاموشی اور تفکر سے رفتہ رفتہ ساری ذہنی اور دلی قوتیں یکجا ہو کر، نفس کی قوتوں کا مقابلہ کر کے، اسے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں دینے اور نفس کو نفس مطمئنہ میں تبدیل کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

خاموشی اور تفکر کے یہی وہ فوائد اور ثمرات ہیں، جس کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اس سے بندہ مومن ایسے مقام پر فائز ہوتا ہے، جو ساٹھ سالہ نفلی عبادت سے بھی نہیں ملتا۔

خاموشی، محض خاموشی نہیں ہے، بلکہ اندر میں ڈوب کر وہاں سے موتی وجواہر لانے کا ذریعہ ہے، یہ خاموشی بندہ مومن کے ایمان ویقین میں ارتقا اور اس کی روحانی قوتوں میں اضافہ کا موجب ہے، خاموشی سے دل اور روح کو موقعہ ملتا ہے کہ وہ محبوب سے راز ونیاز کے عمل کو جاری رکھ سکیں اور اسے ارتقائی صورت دے سکیں، خاموشی و تفکر سے پوری انسانی شخصیت کی ماہیت بدل جاتی ہے اور شخصیت، سلیقہ عبدیت کی سانچے میں ڈھل جاتی ہے، اس لئے بزرگوں کے ہاں تفکر کے کام کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور تفکر کی مشقوں کا

خصوصی اہتما ہوتا رہا ہے، تفکر سے دل کی صلاحیتیں اجاگر ہو کر فطرت سے ہمہ آہنگی ہونے لگتی ہے اور فطرت میں ودیعت شدہ علوم سے بہرہ وری ہونے لگتی ہے۔

تفکر کی مزید اہمیت اس حدیث قدسی سے بھی ثابت ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ مومن کے دل میں ہی سما سکتا ہے، تفکر میں سارا زور دل پر ہوتا ہے کہ وہ کائنات کے اصل جوہر ہستی کے نقوش کو دل میں ثبت کرنے کے لئے کوشاں ہو، دل کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کے لئے ترستا اور بے قرار رہتا ہے، جب تفکر کے مسلسل عمل کے ذریعہ دل اللہ کو پانے اور اسے اپنے دل میں سمانے میں قابل ذکر حد تک کامیاب ہوتا ہے تو دل کا یہ عمل گویا ساٹھ سالہ نفلی عبادت سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے، سبب یہ ہے کہ دل اللہ سے مانوس ہو کر غیر اللہ سے ناموس ہو جاتا ہے۔

مذکورہ حدیث سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ تفکر کا عمل کوئی وقتی اور ہنگامی نوعیت کا نہیں ہے، بلکہ اسے مسلسل کرتے رہنا ہے، مسلسل کرتے رہنے کے نتیجے میں ہی تفکر کے ثمرات ظاہر ہوں گے۔

یہ نکتہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ جس طرح جسم کی کمزوری سے فرد کی قوت کار کردگی متاثر ہوتی ہے، اگر جسمانی کمزوری بہت زیادہ بڑھ جائے تو وہ کسی کام کرنے کے قابل نہیں ہوتا، اسی طرح خیالی قوت کے منتشر ہونے سے اعمال اور اطاعت کی مخلصانہ طور پر بجاآوری میں دشواری پیش آتی ہے اور بڑی مشکل اور بے دلی سے فرائض ادا ہوتے ہیں۔

اگر فرد کی صحت بہتر ہے اور وہ جسمانی طور پر مستحکم ہے تو اس کی قوت کار کردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور وہ مستعدی سے ہر کام سرانجام دینے کے قابل ہوتا ہے، اسی طرح دل اگر تفکر کے مسلسل عمل کے ذریعہ اللہ کے لئے یکسو ہو جاتا ہے، اللہ سے پوری طرح مانوس ہو جاتا ہے تو دل کی اس مستحکم حالت کی وجہ سے سارے دینی اعمال کی بجاآوری میں غیر معمولی طور پر مستعدی پیدا ہو جاتی ہے اور ذہن اور دل کی ساری قوتیں یکسو ہو کر محبوب کے احکامات کی بجاآوری کے لئے آمادہ ہو جاتی ہیں۔

اس حدیث کو اگر اس پس منظر میں پڑھا جائے تو اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور تفکر کے عمل کے فوائد و ثمرات اجاگر ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں جب کہ فکری انتشار میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور دلی سکون بھی غارت ہو گیا ہے، اس طرح کے حالات میں مذکورہ حدیث ہمارے لئے لائحہ عمل کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہم خاموشی اور تفکر سے کام لے کر اپنی شخصیت کو ہر طرح کے بحرانی حالات سے نکال سکتے ہیں، لیکن چونکہ تفکر اور خاموشی کا عمل بہت زیادہ دشوار گزار عمل ہے اور اس عمل کی راہ میں شدید مشکلات درپیش ہیں، اس لئے اس طرف آنے کے لئے آمادگی نہ ہونے کے برابر ہے، اس کا سبب یہ بھی ہے کہ ذہن اور دل کو مادیت پسندی کی طوفانی لہروں سے بچا کر اس عمل سے مزاج کی ہمہ آہنگی پیدا کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، لیکن مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر اتنی بڑی نعمت حاصل نہیں ہو سکتی کہ فرد کا ذہن اور دل اللہ کے لئے مکمل طور پر یکسو ہو جائے۔ اور وہ ایمانی حلاوت سے بہرہ ور ہو۔

نفس سے دستبردار ہونے
اور دل سے فتویٰ پوچھنے کی تلقین

فرمایا: نفس سے دستبردار ہو، اپنے دل سے پوچھو، آپ نے یہ الفاظ تین بار ادا فرمائے، پھر فرمایا کہ نیکی وہ ہے جس سے نفس (امارہ) اور دل کو سکون و طمانیت حاصل ہو، گناہ وہ ہے جس سے نفس (امارہ) اضطراب پیدا ہو، نیکی وہ نہیں ہے جس سے لوگ (تمہارے نیک ہونے کے بارے میں) فتویٰ دیں، بلکہ نیکی وہ ہے جس پر دل فتویٰ دے۔ (مشکوٰۃ)

اس حدیث شریف میں نفس سے دستبردار ہونے اور دل سے فتویٰ پوچھنے پر زور دیا گیا ہے، نفس سے دستبردار ہونا آسان کام نہیں ہے، اس کے لئے غیر معمولی مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے، جب مجاہدوں سے دل، نفس کی یرغمالی سے آزاد ہونے لگتا ہے تو اس وقت نفس کی حالت میں تغیر پیدا ہوتا ہے، یعنی نفس، نفس لوامہ میں تبدیل ہو جاتا ہے، اس وقت نفس لوامہ اور دل کا فتویٰ طاقتور بھی ہوتا ہے تو صحیح بھی ہوتا ہے، نیکی تو حقیقت میں وہ ہے، جس کی نیکی ہونے کے بارے میں دل فتویٰ دے، لوگوں کی رائے اور ان کے فتویٰ صحیح نہیں ہوتی۔

انسان بہت سارے کام ایسے کرتا ہے، جن میں اللہ کی رضا مقصود نہیں ہوتی، وہ یا تو عادت کی خاطر ہوتے ہیں یا ریا کے طور پر ہوتے ہیں، اس طرح کے معاملات کے بارے میں دل کا فتویٰ ہی صحیح ہوتا ہے، اس لئے دل کو صحیح وسالم بنانے کی ضرورت ہے۔

اللہ کے ذکر کے بغیر کثرت کلام نہ کرنے کی تاکید

فرمایا: اللہ کے ذکر کے بغیر کثرت سے کلام نہ کیا کرو، بیشک اللہ کے ذکر کے بغیر کثرت گفتگو قساوت قلبی کا باعث ہے اور قساوت قلبی والا فرد اللہ (کی رحمت) سے سب سے زیادہ دور ہے۔ (ترمذی)

یہ حدیث شریف ہمیں سکھاتی ہے کہ ہماری کوئی بھی مجلس ایسی نہ ہو، جو اللہ کے ذکر سے خالی ہو، مجلس میں دنیا کے حوالے سے ہونے والی گفتگو سے چونکہ دل میں تاریکی پیدا ہوتی ہے اور زیادہ گفتگو سے قساوت قلبی پیدا ہوتی ہے، اس لئے دلوں کو قساوت قلبی سے بچانے کے لئے مجلس کا کچھ نہ کچھ حصہ ایسا ہونا چاہئے، جس میں اللہ کا ذکر ہو، اللہ کے ذکر میں دین کے حوالے سے ہونے والی گفتگو، اللہ کی محبت، فکر آخرت کے حوالے سے ہونے والی گفتگو وغیرہ سب شامل ہیں، اگرچہ اللہ کا ذکر زیادہ افضل ہے۔

قساوت قلبی معمولی بیماری نہیں ہے، بڑی بیماری ہے، اس سے نیکی کو قبول کرنے اور عبرت وموعظت کی صلاحیت بُری طرح متاثر ہوتی ہے، اس سے بچنے کے لئے مجلس کا کچھ نہ کچھ حصہ ذکر میں ضرور صرف ہونا چاہئے، اس سے مجلس میں ہونے والی گفتگو سے پیدا ہونے والے تاریکی کے اثرات ختم ہوتے ہیں۔

اللہ کے ذکر کے بغیر مجلس سے اٹھنے کی کراہت

فرمایا: کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہوئے، اور اگر وہ اللہ کا ذکر کئے بغیر مجلس سے اٹھے تو گویا وہ مردار گدھے کی طرح اٹھے، ایسی مجلس (قیامت کے دن) ان کے لئے باعث حسرت ہوگی۔ (ابوداؤد ۴۸۵۵)

اس حدیث شریف میں بھی مجلس میں اللہ کے ذکر کی بالواسطہ طور پر تاکید فرمائی گئی ہے، ایسی مجلس جس میں اللہ کا ذکر نہ ہو، اسے مردہ گدھے سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی ایسی مجلس میں رخصت کے وقت ہر فرد گویا مردہ گدھے سے مشابہ ہے، اس طرح کی مجلس قیامت کے دن فرد کے لئے باعث حسرت ہوگی۔

ہماری آج کل کی مجلسوں میں نہ صرف یہ کہ اس بات کا اہتمام نہیں ہوتا، بلکہ اللہ سے دوری اس قدر غالب ہوتی ہے کہ اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی، مجلس میں دنیا بھر کے حالات کا تجزیہ ہوتا ہے، اپنوں اور غیروں سب کا ذکر ہوتا ہے، لیکن اگر نہیں ہوتا تو اللہ کا ذکر نہیں ہوتا، اللہ کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے اس طرح کی مجلسیں سراسر ظلمات کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور آخرت میں حسرت کا موجب بھی۔

اپنے آنے پر لوگوں کے مؤدب ہو کر کھڑے ہونے کی آرزو رکھنے والے کی سزا

فرمایا: جسے یہ پسند ہو کہ لوگ ان کے آنے سے مؤدب ہو کر کھڑے ہوں، اس کو چاہئے کہ اپنے لئے جہنم میں جگہ بنالے۔ (مشکوۃ المصابیح/ کتاب الآداب/ حدیث: ۴۶۹۹)

عہدے، منصب اور معاشی اعتبار سے بڑے لوگوں کا یہ مزاج بن جاتا ہے کہ ان کے آنے سے اس کے ماتحت کھڑے ہوں، تاکہ ان کے جذبہ انانیت کو تسکین ملے، اگر وہ کھڑے نہیں ہوتے تو وہ غصہ ہو جاتے ہیں اور اسے اپنی بے عزتی شمار کرنے لگ جاتے ہیں۔

یہ حرکت بندہ ہو کر اللہ کے دوسرے بندوں سے اپنی آداب عبدیت بجالانے کے مترادف ہے جو بڑے گناہوں میں شامل ہے، تکبر کی نفسیات ایسی ہے جو فرد کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے، تکبر کی یہ نفسیات دولت اور عہدوں سے عام طور پر پیدا ہونے لگتی ہے، اس حدیث شریف میں ایسے لوگوں کو انتباہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائیں، ورنہ جہنم ہی ان کا ٹھکانہ ہوگا۔

بزرگوں کے ہاں بھی عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ان کے آنے سے ان کے معتقدین تکریم کی وجہ سے کھڑے ہوتے ہیں، اگرچہ بزرگ ان کی اس ادا کو پسند نہیں کرتا، اس لئے یہ کھڑا

ہونا، اس حدیث کے رمزے میں نہیں آتا، یہ محبت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہوتا ہے، تاہم احتیاط اس میں ہے کہ ایسا نہ کیا جائے اور کھڑا ہونے سے بچا جائے۔

اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا، کبیرہ گناہوں میں شامل ہونا

ایک فرد نے پوچھا، یارسول اللہ، کبیرہ گناہ کون سے ہیں، آپ نے فرمایا، اللہ سے شرک کرنا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا اور اللہ کے فضل سے ناامید ہونا۔ (طبرانی)

کبیرہ گناہوں میں شرک تو ناقابل معافی گناہ ہے ہی، اگرچہ توبہ کرنے سے وہ بھی معاف ہو جاتا ہے، لیکن اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے مایوس ہونا، اس کا کبیرہ گناہوں میں شامل ہونا، بندے کے لئے انتباہ بھی ہے تو ایک اعتبار سے تسلی بھی کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے گناہوں کی معافی کے لئے اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے کسی بھی صورت میں مایوس نہ ہو، اللہ کی رحمت اتنی وسیع ہے کہ وہ توبہ سے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

بندے پر یہ اللہ کا کتنا بڑا انعام ہے کہ وہ اس کی ساری سیاہ کاری کے باوجود اس کو اپنی رحمت اور اپنے فضل کے دائرہ سے نکلنے نہیں دیتا اور اسے اپنی رحمت سے مایوس ہونے نہیں دیتا، اور اس مایوسی کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔

بندہ زندگی کے ہر موڑ پر توبہ تائب ہو کر اللہ کی طرف رجوع ہو تو اللہ کی رحمت اسے گھیر لیتی ہے، اور اس کے لئے نیکی کے راستے کھول دیتی ہے، اس لئے اللہ کی رحمت اور اس کے فضل سے مایوسی کی گنجائش ہی نہیں۔